بہارِ اُردو

(اُردو لازمی)

برائے جماعت نہم

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

مؤلفین: • عبداللہ شاہ ہاشمی
• میاں عبدالرحمٰن عابدؔ
• راحیلہ تنویر

ایڈیٹر: • محمود احمد کاوشؔ

نگران: • ریاض حسین
• محمد زبیر ساہی
• عالیہ شاہ

پروف خوانی: • ایاز اصغر شاہین

کمپوزنگ و پروسیسنگ: مکتبۂ دریافت، اُردو بازار، لاہور۔

ناشر: رولینڈ پرنٹرز اینڈ پبلشرز لاہور۔

مطبع: علی عمران راجپوت پرنٹرز، لاہور۔

بہارِ اُردو

(اُردو لازمی)

برائے جماعت نہم

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

وزیراعلیٰ (پنجاب) کا پیغام

عصرِ حاضر علمی ترقی کی انتہاؤں کو چھو رہا ہے۔ ترقی یافتہ اقوام کا طرۂ امتیاز اعلیٰ تعلیمی معیار ہے۔ اس مقصد کے حصول میں نصاب اور درسی کتب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جن کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہماری حکومت کا تعلیمی میدان کو فوقیت دینا ثابت کرتا ہے۔ نصاب کی ازسرِنو تشکیل کے ساتھ ساتھ درسی کتب کی تصنیف و تدوین میں بھی ہم نے کہنہ مشق ماہرین کی خدمات حاصل کیں جو اعلیٰ معیارِ تعلیم کے حصول میں یقیناً ممد و معاون ہوں گی۔

عزیز طلبہ و طالبات! زندگی کے اعلیٰ معیار کے حصول میں علمی ترقی اور اعلیٰ معیار بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہماری حکومت اس بنیاد کی فراہمی کے لیے مقدور بھر کوششیں کر رہی ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان نصابی کتب سے استفادہ کریں اور پاکستان کی تعمیر و ترقی میں بھرپور کردار ادا کریں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ ہماری نسلِ نو جدید تعلیمی تقاضوں کو مدِنظر رکھ کر ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین

چودھری پرویز الٰہی
وزیراعلیٰ پنجاب

پیش لفظ

تعلیمی پالیسی 1998 تا 2010ء نے نصاب کو علمی ترقی کے لیے سنگِ بنیاد تصور کرتے ہوئے بڑی اصلاحات، جن میں تعلیم کی تمام سطحوں کے لیے نصاب و کتاب کی نئے سرے سے تدوین شامل ہے، کے لیے اقدام اُٹھانے کی سفارش کی ہے۔

سائنس اور ریاضی کے نصاب کی نظر ثانی کے بعد گورنر پنجاب نے محکمہ تعلیم کو پہلی جماعت سے بارہویں جماعت تک ''انسانیات'' کے نصاب کی عصری تقاضوں سے ہم آہنگی اور نظر ثانی کا حکم دیا چنانچہ محکمہ تعلیم پنجاب نے ''انسانیات'' کے نصاب کی نظر ثانی کے کام کو بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ 2002 میں وزارتِ تعلیم، اسلام آباد نے انسانیات کے نئے نصاب کو قومی سطح پر لاگو کرنے کی منظوری دے دی۔

نئے تصورات، نت نئے علوم و معلومات، تحقیقی تسلسل، جدید طریقہ ہائے تدریس، قومی خواہشات، مطالبات و توقعات اور سب سے بڑھ کر کچھ نیا پن ہونے کی خواہش نصاب و کتاب کی باقاعدگی سے عصری ہم آہنگی و نظر ثانی کا ہمیشہ ہی سے تقاضہ کرتی ہے۔

یہ نصابی کتاب نئے نصاب کے مطابق تحریر شدہ ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ طلبہ و طالبات، والدین اور ماہرینِ تعلیم اس نصابی کتاب کے بارے میں اپنی قیمتی آرا۔ سے مسلسل آگاہ فرمائیں گے تاکہ ہم اپنے اگلے ایڈیشن میں اسے مزید بہتر بنا سکیں۔

میں اپنے فرائض سے کوتاہی برتوں گی اگر میں نصاب اور ٹیکسٹ بک ریویو کمیٹی کے ممبران کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی شبانہ روز محنت نے اس ٹیکسٹ بک کو حتمی شکل میں پیش کرنے کی سعی کی۔

میں تمام ماہرینِ تعلیم، قومی ریویو کمیٹی اور کریکولم ونگ وزارتِ تعلیم، اسلام آباد کے ممبران کی بھی شکر گزار ہوں جن کے تعاون سے اس کام کی تکمیل کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ مصنفین، ایڈیٹرز اور دیگر افراد جنھوں نے یک جان ہو کر یہ کام مکمل کیا میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔

سب سے بڑھ کر میں خُدائے بزرگ و برتر کی انتہائی شکر گزار ہوں جس نے قومی نوعیت کے اس اہم کام کے لیے ہمیں سعادت اور ہمت بخشی۔

میں دُعا گو ہوں کہ ہماری یہ کوشش نئے زمانے کا نقطۂ آغاز ثابت ہو۔ ایک ایسا زمانہ جس میں پاکستان بہت زیادہ ترقی کرے اور ترقی یافتہ اقوام کی صف میں ہم قدم ہو جائے آمین۔

ڈاکٹر فوزیہ سلیمی

چیف کوارڈینیٹر

کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک کمیٹی، پنجاب

پرنسپل،

گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن برائے خواتین

مورخہ: 01-03-2003

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست

سید سلیمانؒ ندوی
(1884ء-1953ء)

رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَ سَلَّم کے اخلاق

کسی نے اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا کہ حضور انور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے اخلاق کیسے تھے؟ اُنھوں نے کہا: کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟ جو کچھ قرآن میں ہے وہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے اخلاق تھے۔" یہ بھی آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا ایک معجزہ ہے۔ خود قرآن نے اس کی شہادت دی اور کہا:

ترجمہ: "بے شک اے محمدؐ! آپ حُسنِ اخلاق کے بہت بڑے مرتبے پر ہیں۔"

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نہایت خاکسار، ملنسار، مہربان اور رحم دل تھے۔ چھوٹے بڑے سب سے محبت کرتے، نہایت سخی، فیاض اور داد و دہش والے تھے۔ امکان بھر سب کی درخواست پوری کرتے۔ تمام عمر کسی کے سوال پر "نہیں" نہیں کہا۔ خود بھوکے رہتے اور دوسروں کو کھلاتے۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ کی شادی ہوئی، اُن کے پاس ولیمے کا سامان نہ تھا۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے اُن سے فرمایا کہ عائشہؓ کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔ حالاں کہ اس آٹے کے سوا شام کے لیے گھر میں کچھ بھی نہ تھا۔ فیاضی اور دنیا کے مال سے بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ گھر میں نقد قسم کی کوئی چیز بھی ہوتی تو جب تک وہ سب خیرات نہ کر دی جاتی آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اکثر گھر میں آرام نہ فرماتے۔ ایک بار فِدک کے رئیس نے چار اونٹوں پر غلہ بھیجا۔ اس کو بیچ کر قرض ادا کیا گیا، پھر بھی کچھ بچ رہا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے کہا جب تک کچھ باقی رہے گا میں گھر میں نہیں جا سکتا۔ رات مسجد میں بسر کی، دوسرے دن جب معلوم ہوا کہ وہ غلہ تقسیم ہو چکا ہے تب گھر تشریف لے گئے۔

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم بڑے مہمان نواز تھے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے یہاں مُسلمان، مشرک اور کافر سب ہی مہمان ہوتے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ

وَسَلَّم سب کی خاطر کرتے اور خود ہی سب کی خدمت کرتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ مہمان آجاتے اور گھر میں جو کچھ موجود ہوتا وہ ان کو کھلا پلا دیا جاتا اور پورا گھر فاقہ کرتا۔ راتوں کو اُٹھ کر مہمانوں کی دیکھ بھال فرماتے کہ اُن کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ گھر میں رہتے تو گھر کے کام کاج اپنے ہاتھوں سے کرتے۔ اپنے پھٹے کپڑے آپ سی لیتے' اپنے پھٹے جوتے کو خود گانٹھ لیتے' بکریوں کا دودھ اپنے ہاتھوں سے دوہتے۔ مجمع میں بیٹھتے تو سب کے برابر ہو کر بیٹھتے۔ مسجدِ نبوی کے بنانے اور خندق کھودنے میں سب مزدوروں کے ساتھ مل کر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے بھی کام کیا۔

غریبوں کے ساتھ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا برتاؤ ایسا ہوتا کہ ان کو اپنی غریبی محسوس نہ ہوتی۔ ان کی مدد فرماتے اور اُن کی دل جوئی کرتے۔ اکثر دُعا مانگتے تھے کہ خداوند! مجھے مسکین زندہ رکھ' مسکین اُٹھا اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر کر۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم مظلوموں کی فریاد سُنتے اور انصاف کے ساتھ اُن کا حق دلاتے۔ کمزوروں پر رحم کھاتے' بے کسوں کا سہارا بنتے' مقروضوں کا قرض ادا کرتے۔ حکم تھا کہ جو مسلمان مر جائے اور اپنے ذمے قرض چھوڑ جائے تو مجھے اطلاع دو' میں اس کو ادا کر دوں گا اور وہ جو ترکہ چھوڑ جائے وہ وارثوں کا حق ہے' مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم بیماروں کو تسلی دیتے' ان کو دیکھنے جاتے' دوست، دشمن اور مومن و کافر کی اس میں کوئی قید نہ تھی۔ گنہگاروں کو معاف کر دیتے' دشمنوں کے حق میں دُعائے خیر فرماتے۔ جانی دشمنوں اور قاتلانہ حملہ کرنے والوں تک سے بدلہ نہیں لیا۔ ایک بار ایک شخص آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کو دیکھ کر ڈر گیا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا: ''ڈرو نہیں' اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے بھی تو نہیں کر سکتے تھے۔''

ہبار بن الاسود جو ایک طرح سے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا کا قاتل تھا۔ فتحِ مکہ کے موقعے پر اُس نے چاہا کہ ایران بھاگ جائے لیکن وہ سیدھا حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے پاس آیا اور کہا: ''یارسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم! مَیں بھاگ کر ایران جانا چاہتا تھا لیکن آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا رحم و کرم یاد آیا۔ اب میں حاضر ہوں اور میرے جن جرموں کی خبر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کو ملی

ہے وہ درست ہیں۔" حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے اس کو معاف کر دیا۔

ہمسایوں کی خبر گیری کرتے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اُن کو تحفے بھیجتے' اُن کا حق پورا کرنے کی تاکید فرماتے رہتے۔ ایک دن صحابہؓ کا مجمع تھا' آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا:

"خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔"

صحابہؓ نے پوچھا: "کون یارسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم؟" فرمایا:

"جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے بچا ہوا نہ ہو۔"

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم پڑوسیوں کے گھر جا کر اُن کے کام کر آتے۔ پڑوسیوں کے سوا اور جو بھی آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم سے کسی کام کے لیے کہتا اس کو پورا فرماتے۔ مدینے کی لونڈیاں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی خدمت میں آتیں اور کہتیں: "یارسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم میرا یہ کام ہے۔" آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم فوراً اُٹھ کھڑے ہوتے اور اُن کا کام کر دیتے۔ بیوہ ہو یا مسکین یا کوئی اور ضرورت مند' سب ہی کی ضرورتوں کو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم پورا فرماتے اور دوسروں کے کام کرنے میں عار محسوس نہ فرماتے۔ بچوں سے بڑی محبت فرماتے تھے' اُن کو چومتے اور پیار کرتے تھے۔ فصل کا نیا میوہ سب سے کم عمر بچہ جو اس وقت موجود ہوتا اس کو دیتے۔ راستے میں بچے مل جاتے تو خود ان کو سلام فرماتے۔

اسلام سے پہلے عورتیں ہمیشہ ذلیل رہی ہیں لیکن ہمارے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے اُن پر بہت احسان فرمایا' اُن کے حقوق مقرر فرمائے اور اپنے برتاؤ سے ظاہر فرما دیا کہ یہ طبقہ حقیر نہیں ہے' بلکہ عزت اور ہمدردی کے لائق ہے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے پاس ہر وقت مردوں کا مجمع رہتا تھا۔ عورتوں کی درخواست پر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے اُن کے لیے ایک خاص دن مقرر فرما دیا تھا۔ عورتیں دلیری اور بے تکلفی سے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم سے مسائل پوچھتیں' لیکن آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم بُرا نہ مانتے' ان کی خاطرداری کا خیال رکھتے تھے۔

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ساری دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے تھے اس

لیے کسی کے ساتھ بھی زیادتی اور ناانصافی کو پسند نہ فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ جانوروں کے ساتھ لوگ جو بے پروائی برتتے تھے وہ بھی آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو گوارا نہ تھی اور ان بے زبانوں پر جو ظلم ہوتا آیا تھا اس کو روک دیا۔ ایک بار ایک صاحب نے ایک پرندے کا انڈا اُٹھا لیا' چڑیا بے قرار ہو کر پر مار رہی تھی۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے پوچھا کہ کس نے اس کا انڈا لیا ہے اور اس کو دکھ پہنچایا ہے؟ ان صاحب نے کہا ''یا رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ! میں نے یہ کیا ہے۔'' آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا: ''وہیں رکھ دو۔''

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی نظر میں امیر غریب سب برابر تھے۔ قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی۔ لوگوں نے حضرت اُسامہؓ، جن کو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم بہت چاہتے تھے، ان سے سفارش کرائی۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے سب سے فرمایا کہ:

''تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے برباد ہو گئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی جرم کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب معمولی آدمی جرم کرتا تو وہ سزا پاتا۔ خدا کی قسم اگر محمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم) کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔''

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے دس برس آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی خدمت میں گزارے مگر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے نہ کبھی ڈانٹا' نہ مارا' نہ یہ پوچھا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے تمام عمر کبھی کسی کو نہیں مارا اور یہ کیا عجیب بات ہے کہ ایک فوج کا جرنیل جس نے مسلسل نو برس لڑائیوں میں گزارے اور جس نے کبھی لڑائی کے میدان سے منہ نہیں موڑا' اس نے اپنے دشمن پر کبھی تلوار نہیں اُٹھائی اور نہ اپنے ہاتھ سے کسی پر وار کیا۔ اُحد کے میدان میں جب ہر طرف سے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم پر پتھروں، تیروں اور تلواروں کی بارش ہو رہی تھی۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اپنی جگہ پر کھڑے تھے اور جاں نثار دائیں بائیں کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔

اسی طرح حُنین کی لڑائی میں اکثر مسلمان غازیوں کے پاؤں اُکھڑ چکے تھے' حضور

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم پہاڑ کی طرح اپنی جگہ کھڑے تھے۔ صحابہؓ کہتے ہیں، لڑائی کے اکثر معرکوں میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم وہاں ہوتے تھے جہاں بڑے بڑے بہادر کھڑا ہونا اپنی شجاعت کا آخری کارنامہ سمجھتے تھے، مگر ایسے خوفناک مقاموں میں رہ کر بھی دشمن پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے۔ اُحد کے دن جب مشرکوں کے حملے میں سر مبارک زخمی ہوا اور دندانِ مبارک شہید ہوئے، یہ فرماتے تھے :

''خداوندا! انھیں معاف کر کہ یہ نہیں جانتے۔''

سالہا سال کی ناکامی کی تکلیفوں کے بعد بھی کبھی مایوسی نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے دل میں راہ نہ پائی اور آخر وہ دن آیا جب آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اکیلے سارے عرب پر چھا گئے۔ مکے کی تکلیفوں سے گھبرا کر ایک صحابی نے درخواست کی کہ :

''یارسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم! آپ ہم لوگوں کے لیے کیوں دعا نہیں فرماتے؟''

یہ سُن کر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا چہرۂ مبارک سُرخ ہو گیا اور فرمایا کہ :

''تم سے پہلے جو لوگ گزرے، ان کو آروں سے چیرا گیا، اُن کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی گئیں جس سے گوشت پوست سب کٹ کٹ جاتا لیکن یہ تکلیفیں بھی اُن کو حق سے نہ پھیر سکیں۔ خدا کی قسم دین اسلام اپنے کمال کے مرتبے پر پہنچ کر رہے گا۔ یہاں تک کہ صُنعا (یمن) سے حضرموت تک ایک سوار اس طرح بے خطر چلا جائے گا کہ اُس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔''

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا وہ عزم اور استقلال یاد ہوگا جب آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے اپنے چچا کو جواب دیا تھا کہ :

''چچا جان! اگر قریش میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند رکھ دیں تب بھی حق کے اعلان سے باز نہ رہوں گا۔''

ایک بار دوپہر کو ایک لڑائی میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ایک درخت کے نیچے اکیلے آرام فرما رہے تھے، ایک عرب آیا اور تلوار کھینچ کر بولا: ''بتا اے محمد! (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم) اب تجھ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟'' آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے اطمینان اور تسلی سے بھری ہوئی آواز میں جواب دیا: ''اللہ۔'' وہ یہ جواب سُن کر کانپ گیا

اور تلوار نیام کرلی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک بھوکا آپ کی خدمت میں آیا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ازواجِ مطہرات میں سے کسی کے ہاں کہلا بھیجا۔ جواب آیا ''گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں۔'' آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے دوسرے گھروں میں آدمی بھیجا۔ وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔ غرض آٹھ نو گھروں میں سے کہیں پانی کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہیں نکلی۔

ایک دن آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم بھوک میں ٹھیک دوپہر کو گھر سے نکلے۔ راستے میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ملے۔ یہ دونوں بھی بھوکے تھے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ان کو لے کر حضرت ایوب انصاریؓ کے گھر آئے۔ ان کو خبر ہوئی تو دوڑے آئے اور باغ سے جا کر کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ لائے اور سامنے رکھ دیا۔ اس کے بعد ایک بکری ذبح کی اور کھانا تیار کیا اور سامنے لا کر رکھا۔ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کر فرمایا کہ:

''یہ فاطمہؓ کے یہاں بھجواؤ' اس کو کئی دن سے کھانا نصیب نہیں ہوا ہے۔''

آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے جب وفات پائی ہے تو حالت یہ تھی کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی زِرہ، تین سیر جو پر' ایک یہودی کے پاس گرِوی تھی۔ جن کپڑوں میں وفات پائی اُن میں اُوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔

مزاج مبارک میں سادگی بہت تھی۔ کھانے پینے' پہننے اوڑھنے' اُٹھنے بیٹھنے کسی چیز میں تکلف پسند نہ تھا۔ جو سامنے آجاتا وہ کھالیتے۔ پہننے کے لیے موٹا جھوٹا جو مل جاتا اس کو پہن لیتے۔ زمین پر' چٹائی پر' فرش پر' جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔ خدا کی نعمتوں سے جائز طور پر فائدہ اُٹھانے کی اجازت آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ضرور دی' لیکن تن پروری اور عیش، نہ اپنے لیے پسند فرمایا نہ عام مسلمانوں کے لیے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کسی کے گھر جاتے تو دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے اور اُس کی اجازت مانگتے۔ سامنے اس لیے نہ کھڑے ہوتے کہ نظر گھر کے اندر نہ پڑے۔

صفائی کا خاص خیال رہتا۔ ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھو لیا کرے۔ گفتگو ٹھہر ٹھہر کر فرماتے تھے۔ ایک ایک فقرہ الگ ہوتا

کسی کی بات کاٹ کر گفتگو نہ فرماتے۔ جو بات ناپسند ہوتی اس کو ٹال دیتے۔ زیادہ تر چپ رہتے، بے ضرورت گفتگو نہ فرماتے۔ ہنسی آتی تو مسکرا دیتے۔

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ہر لحظہ اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں لگے رہتے۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے غرض ہر وقت اُسی کی خوشی کی تلاش رہتی اور ہر حالت میں دل اور زبان سے اللہ کی یاد جاری رہتی۔ صحابہؓ کی محفلوں یا بیویوں کے حجرے میں ہوتے اور یکایک اذان کی آواز آتی، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اُٹھ کھڑے ہوتے۔ رات کا بڑا حصہ خدا کی یاد میں بسر ہوتا۔ کبھی پوری پوری رات نماز میں کھڑے رہتے اور بڑی بڑی سورتیں پڑھتے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اللہ تعالیٰ کے بڑے پیارے پیغمبر تھے۔ پھر بھی فرمایا کرتے کہ مجھ کو کچھ نہیں معلوم کہ میرے اوپر کیا گزرے گی۔

ایک صحابیؓ کا بیان ہے کہ ایک بار حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھا تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نماز پڑھ رہے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے اس قدر ہچکیاں بندھ گئی تھیں کہ معلوم ہو رہا تھا کہ چکی چل رہی ہے یا ہانڈی اُبل رہی ہے۔ ایک بار آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ایک جنازے میں شریک تھے۔ قبر کھودی جا رہی تھی، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم قبر کے کنارے بیٹھ گئے اور یہ منظر دیکھ کر رونے لگے یہاں تک کہ زمین تر ہو گئی پھر فرمایا:

"بھائیو! اس دن کے لیے سامان کر رکھو۔"

سوالات

1۔ سبق کے متن کو مدِ نظر رکھ کر خالی جگہیں پُر کیجیے۔

i۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے اخلاق بھی آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا.......... ہیں۔

ii۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نہایت سخی، فیاض اور.......... والے تھے۔

iii۔ چار اونٹوں پر.......... کے رئیس نے غلّہ بھیجا۔

iv۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ساری دنیا کے لیے.......... بن کر آئے۔

v۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو جو بات ناپسند ہوتی اسے.......... دیتے۔

2۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھیے۔

i۔ رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے اخلاق کے متعلق حضرت عائشہؓ نے کیا ارشاد فرمایا؟

ii۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم مہمانوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے؟

iii۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ہبار بن الاسود کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟

iv۔ قبیلہ مخزوم کی عورت کی سفارش کیے جانے پر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے کیا ارشاد فرمایا؟

v۔ عورتوں کی حیثیت کو بلند کرنے کے لیے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے کیا ارشاد فرمایا؟

3۔ واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیے۔

اخلاق۔ معجزہ۔ تفسیر۔ صحابی۔ رئیس۔ مشرک۔ کافر۔ مسکین۔ حقوق۔ طبقہ۔

4۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفّظ اِعراب کی مدد سے واضح کیجیے۔

حضور۔ دہشت۔ مہمان۔ سفارش۔

5۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

بیمار۔ دوست۔ مومن۔ خیر۔ دعا۔ درست۔ دکھ۔

6۔

(ب)	(الف)
علامہ اقبالؒ	شاعر
محمد علی جناحؒ	راہنما
پاکستان	ملک
اسلام آباد	دارالحکومت
سیف الملوک	جھیل
قرآن مجید	کتاب
الخالد	ٹینک
چناب	دریا
نارووال	شہر

کالم (الف) اور کالم (ب) کے کلمات کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ (الف) عام اشخاص، جگہوں اور چیزوں کے ناموں پر مشتمل ہے جب کہ (ب) میں خاص لوگوں، جگہوں اور چیزوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ پہلی قسم کے کلمات کو عام اسم (اسمِ نکرہ) کہتے ہیں جب کہ دوسری قسم کے کلمات کو خاص اسم (اسمِ معرفہ) کہتے ہیں۔

اس سبق سے پانچ عام اسم اور پانچ خاص اسم تلاش کیجیے۔

☆O☆

سرسید احمد خاں
(1817ء-1898ء)
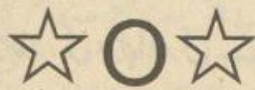
اُمّید کی خوشی

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک، اے آسمان کے تارو، تمھاری خوش نما چمک، اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دُھندلی چوٹیو، اے پہاڑ کے عالی شان درختو، اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دِل کش بیل بُوٹو، تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوش نما معلوم ہوتے ہو؟ اِس لیے کہ ہم سے بہت دُور ہو۔ اِس دُوری ہی نے تم کو یہ خوب صورتی بخشی ہے، اِس دُوری ہی سے تمھارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے۔ ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دُور ہے وُہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے۔

وہ چیز کیا ہے؟ کیا عقل ہے؟ جس کو سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ کیا وہ ہم کو آئندہ خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے۔ بڑی دَوڑ دُھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی ہے، جو سب کے سامنے ہے۔

او نورانی چہرے والی یقین کی اِکلوتی خوب صورت بیٹی، اُمید! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تُو ہی ہمارے مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلّی دیتی ہے، تو ہی آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے، تیری ہی بدولت نہایت دُور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی، خوشی کے لیے نام آوری، نام آوری کے لیے بہادری، بہادری کے لیے فیاضی، فیاضی کے لیے محبت، محبت کے لیے نیکی، نیکی کے لیے صلہ تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع او[ر] تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

وہ پہلا انسان جب شیطان کے چنگل میں پھنسا تو صرف تُو ہی اس کے ساتھ تھی تُو نے

اُس کو نا امید نہ ہونے دیا، اور پھر اس کو اس اعلیٰ درجے پر پہنچایا جہاں کہ فرشتوں نے اُسے سجدہ کیا تھا۔

اے آسمانوں کی روشنی، اے نا اُمیدوں کی تسلّی، اُمید! تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل ملتا ہے، تیرے ہی پاس ہر دَرد کی دَوا ہے، تجھی سے ہر ایک رنج میں آسُودگی ہے۔ عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سائے کو ڈھونڈتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ اور بہتی ہوئی لہریں اُس کے دل کو راحت دیتی ہیں، اُس کے مَرے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں، تمام فکریں دل سے دُور ہوتی ہیں اور دُور دراز زمانے کی خوشیاں سب آ موجود ہوتی ہیں۔

دیکھ نادان بے بس بچہ گھوارے میں سوتا ہے، اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دَھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گھوارے کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے، سو رہ میرے بچے سو رہ! اے اپنے باپ کی مُورت اور اے میرے دل کی ٹھنڈک سو رہ! اے میرے دل کی کونپل سو رہ! بڑھ اور پھل پھول تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پاوے۔ کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی ہے تُو نہ دیکھے، سو رہ میرے بچے سو رہ! تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا، تیری خصلت جو تُو ہم سے کرے گا۔ آخر کار ہمارے دل کو تسلی دے گی، تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا۔ تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دُور کریں گی۔ تیری آواز ہمارے لیے خوش آئند راگنیاں ہوں گی۔ سو رہ میرے بچے سو رہ! اے ہماری امیدوں کے پودے سو رہ! بولو جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جاویں گے تو تم کیا کرو گے؟ تم ہماری بے جان لاش کے پاس کھڑے ہو گے، تم پوچھو گے اور ہم کچھ نہ بولیں گے، تم روؤ گے اور ہم کچھ رحم نہ کریں گے، اے میرے پیارے رونے والے! تم ہمارے ڈھیر پر آ کر ہماری رُوح کو خوش کرو گے۔ آہ! ہم نہ ہوں گے اور تم ہماری یادگار میں آنسو بہاؤ گے۔ اپنی ماں کا محبت بھرا چہرہ اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کرو گے۔ آہ! ہم کو یہی رنج ہے کہ اس وقت ہماری محبت یاد کر کر تم رنجیدہ ہو گے۔ سو رہ میرے بچے سو رہ۔

یہ امید کی خوشیاں ماں کو اُس وقت تھیں جب کہ بچہ غُوغاں بھی نہیں کر سکتا تھا، مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور اماں اماں کہنا سیکھا۔ اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اُس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی۔ آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتشِ محبت بھڑکانے کے قابل ہوا۔ پھر مکتب سے سروکار پڑا۔ رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ہاتھ مُنہ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے اور بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہوں گی۔ اس کے ماں باپ، اس معصوم سینے سے سچی ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں اور ہماری پیاری اُمید! تُو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

دیکھو! وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔ اُس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں سے غائب ہو گیا ہے، وہ اس کو ڈھونڈتا ہے پر نہیں ملتا، مایوس ہے پر امید نہیں ٹوٹی۔ لہو بھرا، دانتوں پھٹا کُرتا دیکھتا ہے پَر ملنے سے نا امید نہیں۔ فاقوں سے خشک ہے، غم سے زار نزار ہے، روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئی ہیں۔ کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے مگر صرف ایک امید ہے جس نے اس کو وصل کی اُمید میں زندہ اور اس خیال میں خوش رکھا ہے۔

دیکھو! وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنویں میں سات تہ خانوں میں بند ہے۔ اُس کا سورج سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے۔ بے یار و دِیار، غیر قوم اور غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے۔ بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو سخت غمگین رکھتی ہے۔ قید خانے کی مصیبت، اس کی تنہائی، اس گھر کا اندھیرا اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال اس کو نہایت ہی رنجیدہ رکھتا ہے۔ اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے مگر ہمیشہ زندہ رہنے والی اُمید تجھی میں اس کی خوشی ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے، کُوچ پر کُوچ کرتے کرتے تھک گیا

ہے، ہزاروں خطرے درپیش ہیں مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چُپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سُنسان کا عالم ہوتا ہے۔ دِلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور لڑائی کے بِگل کی آواز سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے اور وہ آنکھ اُٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سُنتا ہے اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اَے بہادروں کی قوتِ بازو اور اے بہادری کی ماں تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال اُن کے دِلوں کو تقویت دیتا ہے۔ ان کا کان نقارے میں سے تیرے نغمے کی آواز سُنتا ہے۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید جب کہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے، مُنہ پر مُردنی چھاتی ہے۔ ہَوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے، تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔

اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ملتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بندسی ہوتی ہوئی آنکھوں کی غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے، تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لیے موسمِ بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ اس لازوال آنے والی خوشی کی امید تمام دنیاوی رنجوں اور تکلیفوں کو بھُلا دیتی ہے، اور غم کی شام کو خوشی کی صبح سے بدل دِیتی ہے۔ گو کہ مَوت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوف ناک چیز ہے، اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، جہاں

سورج کی کرن اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہنچتی۔ تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے۔ ایمان کے توشہ اور امید کے ہادی اور موت کی سواری سے مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوب صورت بیٹی ہے، جس کا پیارا نام "اُمید" ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے، وہ اپنے اُس بے تکلیف آنے والے زمانے کی اُمید میں نہایت بردباری سے اور رنجوں کے زمانے کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے جان دیتا ہے۔

سوالات

1۔ سبق کا متن مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھیے۔

(الف) مصنف کے نزدیک عقل اور امید کے دائرہ کار میں کیا فرق ہے؟

(ب) ماں اپنے ننھے منے بچے کو کیا لوری دیتی ہے؟

(ج) میدانِ جنگ میں کون سی چیز سپاہی کے دل کو تقویت پہنچاتی ہے؟

2۔ اس سبق کا خلاصہ لکھیے۔

3۔ مندرجہ ذیل الفاظ و محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

آسمان سے باتیں کرنا۔ دوڑ دھوپ کرنا۔ آنکھیں سفید ہو جانا۔ شکستہ خاطر۔ گوہرِ مراد پانا۔

4۔ مندرجہ ذیل واحد الفاظ کے جمع لکھیے۔

مصیبت۔ خصلت۔ تکلیف۔ زمانہ۔ قوت۔ توقع۔

5۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کی مدد سے واضح کیجیے۔

عقل ۔ بہادری۔ چنگل ۔فرشتہ ۔مبارک ۔ بادل ۔ مذہب ۔توقع۔

6۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

مشکل۔ بہادری۔ خوبیاں۔ نا امید۔ موت۔ ذلت۔ اعلیٰ۔ نادان۔ خزاں۔ بے جان۔ غائب۔

7۔ مندرجہ ذیل اقتباسات کی تشریح کیجیے۔

(الف) اے آسمانوں کی روشنی ....آ موجود ہوتی ہے۔

(ب) دیکھو! وہ بے گناہ قیدی ....اس کی خوشی ہے۔

8۔ نیچے دیے گئے کالم ''الف'' اور کالم ''ب'' کی عبارت پر غور کیجیے۔

کالم ''الف''	کالم ''ب''
عائشہ میری بہن ہے۔ عائشہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ عائشہ نے پچھلے سال اپنی جماعت میں پہلا انعام حاصل کیا۔ عائشہ ڈاکٹر بن کر دُکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔	عائشہ میری بہن ہے۔ وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ اُس نے پچھلے سال اپنی جماعت میں پہلا انعام حاصل کیا۔ وہ ڈاکٹر بن کر دُکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔

کالم ''الف'' میں عائشہ کا نام بار بار استعمال ہوا ہے، نام کی یہ تکرار ناگوار گزرتی ہے جبکہ کالم ''ب'' میں عائشہ کا نام لکھنے کی بجائے ''وہ'' اور ''اُس'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ تکرار سے بچنے کے لیے اسم کی جگہ جو کلمہ استعمال کیا جاتا ہے اُسے اسمِ ضمیر کہتے ہیں۔

اس سبق سے پانچ اسم ضمیر تلاش کر کے لکھیے۔

☆O☆

چودھری افضل حق

(1891ء-1942ء)

ایک خادمِ خلق کی کہانی

والدِ مرحوم نے دریا کے کنارے ایک خُوش نما اعلیٰ درجے کا مکان تیار کرایا تھا یہ جگہ میری دِل پسند تھی۔ برسات کا موسم تھا۔ ایک دن ٹھنڈی ہوائیں چلیں۔ گھٹائیں جھوم کے اُٹھیں۔ بادل تھوڑی دیر تک دل کھول کر برسا، پھر مطلع صاف ہو گیا۔ میں اس مکان کے بالائی حصے میں مستِ سرود بیٹھا تھا۔ ساز اور آواز آپس میں مل مل جاتے تھے یونہی دوپہر ڈھل گئی۔ ابر کا ایک ہلکا سا آوارہ ٹکڑا آفتاب کے چہرے پر چھا گیا۔ اُفقِ مشرق پر خوش نما قوسِ قزح نمودار ہوئی۔ گویا کوئی نیلی پوش حسین ساڑھی میں گوٹا کناری ٹانکے کھڑا ہے۔

میں نے شغلِ طرب چھوڑا اور چھت پر چڑھ کر آسمان کا نکھار دیکھنے لگا۔ دریا بہاؤ پر تھا۔ پانی کناروں سے اُچھل اُچھل پڑتا تھا۔ میں نے اپنی عمر میں ایسی طغیانی اور اتنا پاٹ نہ دیکھا تھا۔ ابھی پانی لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں' ایک ملاح ہلکی کشتی پر بہت سی سواریاں لیے آ رہا ہے۔ دریا کی موجیں ایک دوسری سے ٹکرائیں اور بھنور بنا۔ کشتی گرداب میں پھنسی۔ ملاح نے بہُتیرا سنبھالا مگر کچھ پیش نہ گئی۔ اُدھر میں بھی ہمہ تن متوجہ تھا۔ کھڑا کھڑا فرطِ اضطراب سے بے چین ہو گیا اور پکارا ''سنبھل! سنبھل!!'' مگر کشتی نہ سنبھلی۔

الٰہی! میلوں کا پاٹ بانسوں کی گہرائی۔ ڈوبنے والے ہاتھ پاؤں مارتے تھے اور امداد کے لیے پکارتے تھے۔ وہ بے کسی کا منظر مجھ سے نہ دیکھا گیا رحم! رحم! خدایا رحم!!! کہتا ہوا میں حوصلہ کر کے پانی میں کُودا اور شیر کی طرح دریا کے جگر کو چیرتا ہوا کشتی تک جا پہنچا۔ سواریوں میں بعض لوگ تیراک تھے۔ وہ جان بچا کر ساحلِ سلامتی تک پہنچنا چاہتے تھے۔ میں زور سے پکارا کہ نامردو! عورتوں اور بچّوں کو منجدھار میں چھوڑے جاتے ہو! کچھ غیرت مند پلٹے۔ باقیوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ اس وقت ایک ایک کا سنبھالنا مشکل تھا۔ میں نے دو بچوں اور ایک عورت کو سنبھالا اور لے چلا۔ کچھ دور جا کر معلوم ہوا بوجھ

قوتِ برداشت سے بہت زیادہ ہے۔ کنارا ابھی دُور تھا۔ دل نے ہمت تو نہ ہاری مگر مصلحت نہ مانی۔ مجبوراً ایک لڑکے کو خدا کے حوالے کرنا پڑا۔ وہ ڈوبنے لگا۔ ایک دفعہ عاجزی اور حسرت سے میری طرف دیکھ کر پکارا کہ آپ مجھے نہ بچائیں گے؟

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فرطِ رحم نے دو اور جانوں کی ذمہ داری سے غافل کر دیا۔ میں نتیجے سے بے پروا ہو کر بڑھنا چاہتا تھا کہ اس کو بھی اُٹھا لوں۔ پھر خیال آ گیا کہ اس بارِ عزیز کو تو جان بُوجھ کر پھینکا ہے۔ اک جگر پاش آہ نکلی۔ اس نے مجھے نگاہِ حسرت سے، میں نے اُسے نگاہِ ترحم سے دیکھا۔ اُس نے غوطہ کھایا اور لاکھوں من پانی اُس کے اُوپر سے گزر گیا۔

اتنے میں مَیں نے اپنے وفادار مُلازم کی آواز سنی کہ ''آقا جان! میں آ گیا ہوں''! میں نے کہا۔ ''گُل نواز! اس لڑکے کو جلدی لینا!'' لڑکا اُبھرا، ہاتھ پاؤں مارے۔ چیخا' دوسرا غوطہ کھانا چاہتا تھا کہ گل نواز تیر کی طرح پہنچا۔ پھول کی طرح لڑکے کو اُٹھا لیا اور ہم سہمی ہوئی جانوں کو لے کر چلے۔ گل نواز بولا ''آقا جان! آپ بہاؤ کے ساتھ ساتھ تیر کے کنارے کی طرف آیئے۔ میرا بوجھ کم ہے۔ میں دریا کو چیرتا ہوا چلتا ہوں۔'' میں نے کہا ''جلدی کنارے پہنچو تا کہ جلدی واپس آئیں۔ شاید کوئی اور جان بچ سکے''

ہم دونوں جلدی جلدی دریا چیرتے ہوئے پار ہوئے۔ بچے ڈرے ہوئے دریا سے دُور جا کھڑے ہوئے۔ عورت نے سو دُعائیں دیں۔ میں نے جو دریا کی طرف نظر اُٹھائی' دوسروں کو جو پہلے تیرتے تھے' ڈوبتے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ تیرنے میں پورے مشّاق نہ تھے۔ میں دیکھتے ہی پھر پانی میں کُودا اور کہا ''گل نواز! آؤ ان کو بچائیں! اُس نے کہا ''آقا جان! آیا۔۔۔!''

وہ جواں ہمت بوڑھا ایسا شہ زور تھا کہ شیر کی طرح سیدھا بڑھتا آیا۔ گو میرے پیچھے پانی میں پاؤں ڈالا تھا' لیکن مجھ سے پہلے پہنچا اور ایک ڈوبتے کو سہارا دیا۔ میں بھی زور لگا کر پہنچا۔ دوسرے کو میں نے بچایا۔ اب ہم سُوئے ساحل چلے۔ راحت و آرام کے حصول میں مَیں دریا دل تھا۔ روپے پیسے کو اس کے لیے پانی کی طرح بہاتا تھا لیکن اس وقت مجھے ایسا اطمینانِ قلب نصیب تھا اور ایسی سچی خوشی حاصل تھی کہ دولتِ دُنیا دے کر میسر نہ آ سکتی

تھی۔ میں وفورِ مسرت میں کہنے لگا ''گل نواز! ساحل پر پہنچ لیں۔ تجھ کو اتنی دولت دوں گا کہ تیری اولاد بیٹھی کھائے گی۔'' یہ سن کر وہ رو دیا۔ اُسے دیکھ کر میں آبدیدہ ہوگیا۔ دونوں کو پریشانی تھی۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو انعام کی خاطر جان خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ بہادر اور شریف کے لیے کوئی انعام کافی بھی کیونکر ہو سکتا ہے! اُسے افسوس ہوا کہ میں نے اُسے ایسا سمجھا۔ مجھے شرم آئی۔ میں نے کیا کہ دیا۔ اُسے کلام کا یارا نہ رہا۔ مجھے اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ گو بظاہر تیرتے جا رہے تھے لیکن دراصل دریائے حیرت وندامت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اب کچھ دُور چل کر معلوم ہوا کہ سانس پھول رہا ہے۔ میں نے ہمت کر کے رفتار تیز کر دی۔ پانچ دس قدم گیا تھا کہ بوجھ پہاڑ معلوم ہوا۔ خود غرضی نے کہا: جان ہے تو جہان ہے۔ ایک تو دوسرے کی جان بھی نہ بچائی اور اپنی بھی ساتھ گنوائی۔ یہ کہاں کی دانائی ہے! غیرت بولی: جس کو سہارا دیا اُس کو پار نہ اُتارا۔ یہ کیسی بھلائی ہے! تہوّر مصلحت پر غالب آیا۔ خود غرضی نے غیرت سے شکست کھائی۔ نتیجے سے آنکھیں بند کر کے میں نے اپنا آخری زور لگایا۔ کنارا قریب ہی تھا کہ میرا دم ٹوٹ گیا اور جسے بچا رہا تھا ہاتھ سے اُس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ اُس میں کسی قدر سکت باقی تھی۔ وہ تو پاؤں مارنے لگا۔ میں غوطے کھانے لگا۔ قسمت کے کھیل، ہاتھ پاؤں مارتے اُس کے پاؤں زمین پر جا لگے۔ میں کنارے سے اور الگ ہوتا گیا۔ جو ڈوب رہا تھا وہ بچ نکلا اور جو بچانے آیا تھا وہ ڈوب چلا۔

آخری غوطے سے قبل میں نے دیکھا کہ تماشائیوں کی اس مختصر جماعت میں جن کو ابھی بچایا تھا، اضطرابِ عظیم پیدا ہے۔ بچے بلک بلک کر میری سلامتی کے لیے ''یا خدا رحم! یا خدا رحم!!'' پکار رہے تھے۔ عورتیں دامن پھیلائے دُعائیں مانگ رہی تھیں۔ مرد سربسجود تھے۔ گل نواز نے میرا حال دیکھا۔ چیختا ہوا پانی میں کُودا! یہ آخری نظارہ تھا جو میں نے رُوئے زمین پر دیکھا۔ لوگ مضطرب تھے، میں مطمئن۔ کہاں مجھ سا فاسق و فاجر، کہاں یہ شان دار موت؟ مجھے اس کا وہم بھی نہ گزرا تھا۔

(زندگی)

سوالات

1۔ سبق کا متن مدِ نظر رکھ کر خالی جگہیں پُر کیجیے۔

i۔ بادل تھوڑی دیر تک .... کھول کر برسا۔

ii۔ افقِ مشرق پر خوش نُما .... نمودار ہوئی۔

iii۔ دریا .... پر تھا۔

iv۔ میں نے اپنی عمر میں اتنی طغیانی اور اتنا .... نہ دیکھا تھا۔

v۔ ڈوبنے والے .... مارتے تھے۔

vi۔ سواریوں میں بعض لوگ .... تھے۔

vii۔ گُل نواز .... کی طرح پہنچا۔

viii۔ عورت نے .... دیں۔

ix۔ بہادر اور شریف کے لیے کوئی .... کافی بھی کیوں کر ہو سکتا ہے!

x۔ دل نے ہمت تو نہ ہاری مگر .... نہ مانی۔

2۔ ''جان ہے تو جہان ہے''۔ اس سبق میں یہ ضرب المثل بیان ہوئی ہے ضرب المثل میں انسانی مشاہدات و تجربات کا نچوڑ چند لفظوں میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس میں بیان کی گئی سچائی سب کے لیے یکساں قابل قبول ہوتی ہے۔

مندرجہ ذیل ضرب الامثال کی تکمیل / درستی کیجیے۔

i۔ آسمان سے گرا شیشم میں اٹکا۔

ii۔ ایک کریلا دوسرا .... چڑھا۔

iii۔ بھاگتے چور کی جوتی ہی سہی۔

iv۔ چور کی ڈاڑھی میں ....

v۔ جس کی لاٹھی اس کی گائے۔

3۔ کالم ''الف'' میں کچھ افعال اور اسما لکھے گئے ہیں جب کہ کالم ''ب'' میں قواعد کی اصطلاحات دی گئی ہیں۔ آپ کالم ''ج'' میں ہر فعل یا اسم کے سامنے قواعد کی درست اصطلاح لکھیے۔

کالم ج	کالم ب	کالم الف
	اسمِ نکرہ	تیرنا
	فعل مستقبل	گل نواز
	اسمِ مصدر	ڈوبنے لگے
	فعل ماضی	پہاڑ
	اسمِ معرفہ	دولت دوں گا
	اسمِ اشارہ	عورت
	اسمِ جامد	ڈال لیتے ہیں
	فعل حال	

4۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب لکھیے۔

i۔ ''تہور مصلحت پر غالب آیا۔'' اس جملے کی وضاحت کیجیے۔

ii۔ خادم خلق اپنی موت کو شان دار قرار دیتا ہے، کیوں؟

iii۔ اس کہانی کا مرکزی خیال لکھیے۔

5۔ مندرجہ ذیل الفاظ ومحاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

ہاتھ پاؤں مارنا۔ ہمت ہارنا۔ مشاق۔ پانی کی طرح بہانا۔ پہاڑ معلوم ہونا۔

6۔ اعراب کی مدد سے مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفظ واضح کیجیے۔

موسم ۔تہور۔ سرور۔ افق ۔قوسِ قزح ۔گرداب ۔متوجہ۔ مصلحت ۔ترحم ۔کنارا۔ واپس ۔ بہادر۔ شکست ۔مسرت

7۔ i۔ پاکستان مسلمانوں کا مُلک ہے۔

ii۔ علامہ اقبال کی شاعری عمل پر ابھارتی ہے۔

iii۔ نہر کے کنارے اونچے اونچے درخت ہیں۔

پہلے جملے میں ملک کا تعلق مسلمانوں سے، دوسرے جملے میں شاعری کا تعلق علامہ اقبال سے اور تیسرے جملے میں کنارے کا تعلق نہر سے ہے۔ ان جملوں میں ''کا''، ''کی'' اور ''کے'' ایک اسم کا تعلق دوسرے اسم سے جوڑتے ہیں۔ انھیں حروفِ اضافت کہتے ہیں۔ آپ اس سبق سے دس ایسے جملوں کی نشان دہی کیجیے جن میں حرفِ اضافت استعمال کیا گیا ہو۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ

(1837ء-1914ء)

مرزا غالبؔ کے عادات و خصائل

مرزا غالب کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے ملتا اُسے ہمیشہ ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے دوست، ہر مذہب اور ہر ملت کے، نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں، ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت، غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے ہر ایک خط کا جواب لکھنا اپنے ذمے فرض اوّلین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کو جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض خاص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ ان کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ ان کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے۔ مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تو سخت شکایت کرتے تھے۔

مُروّت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہ غایت تھا۔ باوجود اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے، بایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک کو لکھتے ہیں ''جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا اور اوراقِ اشعار دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سُوجھے اور نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔'' اگر چہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے لُولے اور اپاہج مرد عورت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اُوپر ڈیڑھ سو روپے ہوگئی

تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے۔

مرزا اپنے دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے، نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عمائدین میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے اور 57ء کے بعد ان کی حالت سقیم ہوگئی تھی، ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا کو ملنے آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالدہ یا جامہ دار وغیرہ چوغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا ان سے پوچھا "یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیں۔" انھوں نے کہا "یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے۔ میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے۔ اگر پسند ہے یہی حاضر ہے۔" مرزا نے کہا: "جی تو یہی چاہتا ہے اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے۔" پھر ادھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالدے کا نیا چوغہ اُتار کر انھیں پہنایا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چوغہ ان کی نذر کیا۔

آپ کے مزاج میں ظرافت اس قدر تھی کہ اگر آپ کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے ملنے گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا، "پیرومرشد! ایک نہیں رکھا۔" ایک دن نواب مصطفےٰ خان کے مکان پر ملنے کو آئے۔ ان کے مکان کے آگے چھتا تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں نواب صاحب ان کے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے ان کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا۔

کہ آبِ چشمۂ حیواں دُرونِ تاریکیست

جب دیوان خانے میں پہنچے تو اُس کے دالان میں بہ سبب شرق رُویہ ہونے کے دُھوپ ابھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا۔

این خانہ تمام آفتاب است

ایک صحبت میں مرزا، میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود

تھے۔ انھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا ''میں تو تم کو میری سمجھتا ہوں مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔''

باوجود کہ مرزا کی آمدنی اور مقدور کم تھا۔ مگر خودداری اور حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ شہر کے امرا و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہ نکلتے تھے۔ عمائدِ شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر آتے تھے۔ یہ بھی ان کے مکان پر ضرور جاتے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے مکان پر آئے۔ میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب نے کہا ''آپ مکان سے سیدھے یہیں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا۔'' مرزا صاحب نے کہا ''مجھ کو فلاں صاحب کا ایک آنا دینا تھا۔ اوّل وہاں گیا تھا۔ وہاں سے یہاں آیا ہوں۔''

ایک دن دیوان فضل اللہ مرحوم چرٹ پر سوار مرزا صاحب کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا۔ مضمون یہ تھا۔ آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہوسکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔ جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا تو وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا کو ملنے آئے۔

فواکہ میں آم ان کو بہت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں ان کے دوست دُور دُور سے ان کے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور وہ خود اپنے بعض دوستوں سے تقاضا کر کے آم منگواتے تھے۔ ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ، جن میں مرزا بھی تھے، باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدر ہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا باربار ان آموں کی طرف دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا: ''مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟'' مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: ''اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔'' بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اہلِ شہر تحفہ بھیجتے تھے۔ خود بازار سے منگواتے تھے۔ باہر سے دُور دُور کا آم بہ طَور سوغات کے آتا تھا۔ مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور دیگر احباب موجود تھے اور آم کی نسبت ہر ایک شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہییں۔ جب سب لوگ کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا نے کہا ''بھئی! میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہییں میٹھا ہو اور بہت ہو۔'' اس پر سب حاضرین ہنس پڑے۔

سوالات

1۔ سبق کے متن کو مدِّ نظر رکھ کر خالی جگہ پر کریں۔

i ۔ مرزا غالب دوستوں کو دیکھ کر.......... ہو جاتے تھے۔

ii۔ مرزا غالب ہر ایک خط کا جواب لکھنا اپنے ذمے......... سمجھتے تھے۔

iii۔ مرزا غالب کے مزاج میں......... اس قدر تھی کہ اُنھیں حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔

iv۔ مرزا غالب کی رائے میں آم میٹھا ہو اور.......... ہونا چاہیے۔

v ۔ مرزا غالب......... اور حفظِ وضع کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

2۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

نیت سیر نہ ہونا۔ مرغوب ہونا۔ ندامت ہونا۔ دِل بھر آنا۔ اصلاح دینا۔

3۔ مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کے معنی لکھیے اوران کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

کشادہ پیشانی۔ بدرجہ غایت۔ گردشِ روزگار۔ حیوانِ ظریف۔ حفظِ وضع

4۔ کالم ''ب'' میں لکھی گئیں اصطلاحات کو کالم ''الف'' میں دیے گئے حروف مدنظر رکھ کر درست ترتیب میں کالم ''ج'' میں لکھیں۔

کالم الف	کالم ب	کالم ج
i۔ پھر، و، اور	الف۔ حرفِ جار	
ii۔ کا۔ کی۔ کے	ب۔ حرفِ عطف	
iii۔ میں، سے، تک، اوپر	ج۔ حروف اضافت	

5۔ مولانا حالیؔ کے اس مضمون کی روشنی میں مرزا غالب کے عادات وخصائل لکھیے۔

امتیاز علی تاج
(1900ء-1970ء)

آرام وسکون

ڈاکٹر: جی نہیں بیگم صاحبہ! تردّد کی کوئی بات نہیں، میں نے بہت اچھی طرح معائنہ کرلیا ہے۔ صرف تھکان کی وجہ سے حرارت ہوگئی ہے۔ ان دنوں آپ کے شوہر غالباً کام بہت زیادہ کرتے ہیں۔

بیوی: ڈاکٹر صاحب! ان دنوں کیا، ان کا ہمیشہ سے یہی حال ہے۔ صبح دس بجے دفتر جا کر شام سات بجے سے پہلے کبھی واپس نہیں آتے۔

ڈاکٹر: جبھی تو! میرے خیال میں انھیں دوا سے زیادہ آرام وسکون کی ضرورت ہے۔ کاروبار کی پریشانیاں اور الجھنیں بھلا کر ایک ہی روز آرام وسکون سے گزرا تو طبیعت اِن شاء اللہ بحال ہو جائے گی۔

بیوی: بیسیوں مرتبہ کہہ چکی ہوں۔ اتنا کام نہ کِیا کرو، نہ کِیا کرو۔ نصیبِ دشمناں صحت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے مگر خاک اثر نہیں ہوتا۔ ہمیشہ یہی کہہ دیتے ہیں، کیا کِیا جائے۔ ان دنوں کام بے طرح زور پر ہے۔

ڈاکٹر: ہر روز تھوڑا تھوڑا وقت آرام وسکون کے لیے نہ نکالا جائے تو پھر بیمار پڑ کر بہت زیادہ وقت نکالنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

بیوی: یہ بات آپ نے انھیں بھی سمجھائی؟ میں نے کہا سُن رہے ہو۔ ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟

میاں: ہوں!

ڈاکٹر: جی ہاں۔ میں نے سمجھا کر اچھی طرح تاکید کردی ہے کہ دن بھر خاموش لیٹے رہیں۔

بیوی: تو تاکید کیا میں نہیں کرتی؟ مگر ان پر کسی کے کہنے کا کچھ اثر بھی ہو! اور دوا، کس

کِس وقت دینی ہے؟

ڈاکٹر: جی نہیں۔ دوا کی مطلق ضرورت نہیں۔ بس آپ صرف ان کے آرام وسکون کا خیال رکھیے۔ غذا جو کچھ دینی ہے، میں لکھ چکا ہوں۔

بیوی: بڑی مہربانی آپ کی۔

ڈاکٹر: تو پھر اجازت۔

بیوی: فیس میں آپ کو بھجوا دوں گی۔

ڈاکٹر: اس کی کوئی بات نہیں۔ آجائے گی۔

بیوی: (اونچی آواز سے پکار کر) ارے للّو۔ مَیں نے کہا ڈاکٹر صاحب کا بیگ باہر کار میں پہنچا دیجیو۔

ڈاکٹر: ایک بات عرض کر دوں بیگم صاحبہ۔ مریض کے کمرے میں شور غل نہیں ہونا چاہیے۔ اعصاب پر اس کا بہت مضر اثر پڑتا ہے۔ خاموشی اعصاب کو ایک طرح کی تقویت بخشتی ہے۔

بیوی: مجھے کیا معلوم ڈاکٹر صاحب۔ آپ اطمینان رکھیں ان کے کمرے میں پرندہ پر نہ مارے گا۔ (ملازم آتا ہے)

للّو: حضور!

ڈاکٹر: اٹھا لو یہ بیگ۔ تو آداب!

بیوی: آداب (ڈاکٹر اور ملازم جاتے ہیں، قریب آ کر) میں نے کہا سو گئے کیا؟

میاں: ہوں! یونہی چپکا پڑا ہوا تھا۔

بیوی: بس بس۔ بس بس چپکے ہی پڑے رہیے۔ ڈاکٹر صاحب بہت سخت تاکید کر گئے ہیں کہ نہ آپ بات کریں نہ کوئی آپ کے کمرے میں بات کرے۔ اس سے بھی تھکان ہوتی ہے۔ تمام وقت پورے آرام وسکون میں گزاریں۔ سمجھ گئے نا؟

میاں: ہوں (کراہتا ہے)۔

بیوی: کیوں بدن ٹوٹ رہا ہے کیا؟

میاں: ہوں۔

بیوی: کہو تو دبا دوں؟

میاں: ہوں۔

بیوی: سونے کو جی چاہ رہا ہو تو چلی جاؤں؟

میاں: اچھی بات۔ (کراہتا ہے)۔

بیوی: اگر پیچھے کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو؟ اچھا بُلانے کی گھنٹی پاس رکھے جاتی ہوں۔ گھنٹی کہاں گئی؟ رات میں نے آپ یہاں میز پر رکھی تھی۔ اللہ جانے یہ کون اللہ مارا میری چیزوں کو الٹ پلٹ کرتا ہے؟

(کُنڈی کی آواز) کون ہے یہ نامراد؟ ارے للو! دیکھو یہ کون کواڑ توڑے ڈال رہا ہے؟

للو (دور سے) سقا ہے بیوی جی!۔

بیوی: سقا؟ گھر میں بہرے بستے ہیں۔ جو کم بخت اس زور سے کنڈی کھٹکھٹاتا ہے؟ اللہ ماروں کو اتنا خیال بھی تو نہیں آتا کہ گھر میں کوئی بیمار پڑا ہے۔ ڈاکٹر نے تاکید کر رکھی ہے کہ شور غل نہ ہونے پائے اور اس سے کہو یہ کیا وقت ہے، پانی لانے کا۔ اچھی خاصی دوپہر ہونے آگئی ہے۔ کل سے اتنی دیر میں آیا تو نوکری سے الگ کر دوں گی۔ میں نامراد کو بیسیوں مرتبہ کہلا چکی ہوں کہ صبح سویرے ہو جایا کرے۔ کان پر جوں ہی نہیں رینگتی۔

میاں: ارے بھئی اب بخشو اسے۔

بیوی: بخشوں کیسے؟ ذرا طرح دو تو یہ لوگ سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔

میاں: ہوں۔ (کراہتا ہے)۔

بیوی: کیوں۔ زیادہ درد محسوس ہو رہا ہے؟

میاں: ہوں۔

بیوی: للو سے کہوں آکر دبا دے؟

میاں: اوں ہوں!

بیوی: یہ دیکھو۔ یہاں انگیٹھی پر رکھی ہے۔ آپ بتایئے آپ سے آ گئی یہاں؟ پاؤں تھے اس کے؟ یہ سب حرکتیں اس للّو کی ہیں۔ کم بخت نے قسم کھا رکھی ہے کہ کبھی کوئی چیز ٹھکانے پر نہ رہنے دے گا۔

اللہ جانے یہ نامراد میری چیزوں کو ہاتھ لگاتا کیوں ہے؟ او للّو! ارے للّو!

میاں: ارے بھئی کیوں ناحق غل مچا رہی ہو۔ گھنٹی رات میں نے خود میز پر سے اٹھا کر انگیٹھی پر رکھ دی تھی۔ ہوں (کراہتا ہے)۔

بیوی: تم نے؟ اے ہے وہ کیوں؟

میاں: نھا بار بار بجائے جا رہا تھا۔ میرا دم اُلجھنے لگا تھا۔ ہوں (کراہتا ہے)۔

للّو: (آ کر) مجھے بلایا ہے بیوی جی؟

بیوی: کم بخت۔ اتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں، کہاں مر گیا تھا؟

للّو: آپ نے رِیٹھے کُوٹنے کو کہا۔ وہ گودام میں ڈھونڈ رہا تھا۔

میاں: ہوں (کراہتا ہے)۔

بیوی: صبح سویرے کہا تھا، کم بخت تجھے اب تک رِیٹھے مل نہیں چکے؟

للّو: جی مہلت بھی ملے۔ ادھر گودام میں جاتا ہوں، ادھر کوئی بلا لیتا ہے۔

بیوی: ہاں بڑا کام رہتا ہے نا! بچارے کو سر کھجانے کو فرصت نہیں ملتی۔ بھاگ یہاں سے نکل، جا کر رِیٹھے ڈھونڈ (للّو جاتا ہے)۔ تو یہ گھنٹی یہاں تمھارے سرھانے رکھ جاتی ہوں۔

میاں: (کراہ کر) کواڑ بند کرتی جانا۔

بیوی: پیچھے اکیلے میں جی تو نہ گھبرائے گا تمھارا؟

میاں: (تنگ آ کر) نہیں بابا نہیں۔

بیوی: ارے ہاں۔ یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کھانے کے لیے کیا کیا چیزیں لکھ گئے ہیں۔ کہاں گیا ان کا لکھا ہوا کاغذ؟ اَے لو یہ نیچے پڑا ہوا ہے۔ ابھی

کہیں گوڑے میں چلا جاتا تو۔ ہوں۔ مالٹڈ مِلک (MALTED MILK)
نارنگی کا رَس، ساگودانے کی کھیر، یخنی، کیا تیار کرادوں اس وقت کے لیے؟

میاں: جو جی چاہے۔

بیوی: اس میں میرے جی چاہنے کا کیا سوال؟ کھانا آپ کو ہے یا مجھے؟

میاں: ساگودانہ بنا دینا تھوڑا سا۔

بیوی: بس! اس سے کیا بنے گا؟ یخنی پی لیتے تھوڑی سی۔ چوزے کی یخنی بنوائے دیتی ہوں۔ مقوّی چیز ہے۔

میاں: بنوا دو۔

بیوی: (دو قدم چلتی ہے) مگر میں نے کہا۔ دیر لگ جائے گی۔ یخنی کی تیاری میں، چوزہ بازار سے منگوانا ہوگا اس للّو اللہ مارے کو تو جانتے ہو۔ بازار جاتا ہے تو وہیں کا ہو رہتا ہے۔

میاں: اوں ہوں۔

بیوی: تو پھر یوں کرتی ہوں۔ (صحن میں بچہ پٹ پٹ گاڑی چلانے لگتا ہے)

میاں: ارے بھئی۔ اب یہ کیا کھٹ پھٹ شروع ہوگئی۔

بیوی: ننھا ہے آپ کا۔ عید کے روز میلے میں سے یہ کھلونا گاڑی لے آیا تھا۔ نہ اس کم بخت کا دل اس سے بھرتا ہے، نہ وہ کم بخت ٹوٹتی ہے۔ ارے میں نے کہا ننھے نہیں مانے گا نامراد؟ چھوڑ اس اپنی پٹ پٹ کو۔ جب دیکھو لیے لیے پھر رہا ہے۔ صاحبزادے کا دل کسی طرح پُر ہونے ہی میں نہیں آتا۔ چُولھے میں جھونک دوں گی اس کم بخت کو، اتنا خیال بھی نہیں آتا کہ ابا بیمار پڑے ہیں۔ شور غل سے ان کی طبیعت گھبراتی ہے۔

میاں: ہوں۔ (کراہتا ہے)

بیوی: کم نہیں ہوا درد؟

میاں: اوں ہوں۔

بیوی: دبوا لیتے تو گھٹ جاتا۔

میاں: اوں ہوں۔

بیوی: تو میں کیا کہ رہی تھی؟ کھانے کا پوچھ رہی تھی۔

(پھر ننھے کی پٹ پٹ کی آواز) پھر وہی۔ نہیں مانے گا نامراد ٹھہر تو جا (غصے میں جاتی ہے۔ میاں کراہتا ہے۔ دُور سے بیوی کی آواز آ رہی ہے)

چھوڑ اپنی یہ پٹ پٹ۔ (بچہ رونے لگتا ہے۔) چپ نامراد، اتنا خیال نہیں ابا بیمار پڑے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے شور غل نہ ہو، انھیں تکلیف ہو گی۔ چُپ! خبردار جو آواز نکالی گلا گھونٹ ڈالوں گی۔ (بچہ رونا بند کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے) کم بخت کا جو کھیل ہے، ایسا ہی بے ڈھنگا ہے۔ چل ادھر۔ نہیں چپ ہو گا تو؟ (کھینچتی ہوئی لے جاتی ہے میاں اس ہنگامے سے زچ ہو کر کراہے جا رہا ہے۔ بیوی کی آواز غائب ہوتے ہی کمرے میں جھاڑو پھرنے کی آواز آنے لگتی ہے)

میاں: (چونک کر) ہوں؟ ارے بھئی یہ گرد کہاں سے آنے لگی؟ لاحول ولا قوۃ۔ ارے کیا ہو رہا ہے؟

ملازم: جھاڑو دے رہا ہوں میاں۔

میاں: کم بخت دفع ہو یہاں سے۔

ملازم: جھاڑو نہ دی تو خفا ہوں گی بی بی جی۔

میاں: بی بی جی کا بچہ۔ نکل یہاں سے۔ کہ دے ان سے (ملازم جاتا ہے)۔ کواڑ بند کر کے جا۔ (میاں کراہ کر چپ ہو جاتا ہے)، (ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور بجتی رہی) ارے بھئی کہاں گئیں؟ ارے کوئی ٹیلی فون سننے تو آوَ۔ لاحول ولا قوۃ۔ (خود اٹھتا ہے) ہیلو میں اشفاق بول رہا ہوں۔ بیگم اشفاق کسی کام میں مصروف ہیں۔ اس وقت کمرے میں نہیں ہیں جی۔ یہاں کوئی ایسا نہیں جو انھیں بُلا لائے۔ میں علیل ہوں۔ کیا فرمایا آپ نے؟ آواز دینے کے لیے ضروری نہیں کہ گلا بھی خراب ہو۔ آپ پھر کسی وقت فون کر لیجیے گا۔ میں نے عرض کیا نا،

چوں کہ میں بیمار ہوں، کمرے سے باہر نہیں جا سکتا۔ (زور سے فون بند کرتا ہے)
بدتہذیب۔ گستاخ کہیں کی۔ ہوں۔

بیوی: مجھے بلایا تھا؟ ہے ہے تم اٹھے کیوں۔

میاں: اتنی آوازیں دیں کوئی سنے بھی۔

بیوی: توبہ توبہ، لیٹو لیٹو، میں ذرا گودام میں چلی گئی تھی۔ للّو کو رِیٹھے نکال کر دے رہی تھی۔ بلایا کیوں تھا؟ (ہمسائے کے ہاں گانا شروع ہوتا ہے)

میاں: فون تھا تمھارا۔

بیوی: کس نے کیا تھا؟

میاں: ہوگا کوئی۔ اب مجھے کیا پتا۔

بیوی: جب اٹھ ہی کھڑے ہوئے تھے تو نام پوچھ لینا کوئی گناہ تھا۔

میاں: میں نے کہہ دیا تھا پھر کرلیں فون۔

بیوی: مفت کی الجھن میں ڈال دیا۔ اللہ جانے کون تھی اور کیا چاہتی تھی۔

میاں: اے بھئی کوئی ایسا ضروری کام نہیں تھا۔ ورنہ مجھے پیغام نہ دے دیتیں۔ تم خدا کے لیے ان ہمسائے کے صاحب زادے کا ہارمونیم اور گانا بند کراؤ۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔

بیوی: اب اسے کیوں کر روک دوں مَیں؟

میاں: بابا ایک دفعہ لکھ کر بھیج دو۔ میں بیمار ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے میرے لیے آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ ایک روز اِن صاحب زادے نے نغمہ سرائی نہ فرمائی تو دنیا کسی بہت بڑی نعمت سے محروم نہ ہو جائے گی!

بیوی: کہے تو دیتی ہوں مگر کہیں چڑ نہ جائیں۔

میاں: مناسب الفاظ میں لکھونا۔ ہوں (کراہتا ہے)

(بے سُرے گانے کا شور جاری ہے۔ میاں کراہ رہا ہے۔ یک لخت بچے کے رونے کی آواز)

بیوی: ارے کیا ہو گیا ننھے۔

بچہ: (زور سے) گر پڑا خون نکل آیا۔

بیوی: (زور سے) خط لکھ رہی ہوں ابھی آئی چپ ہو جا۔

میاں: (کراہتے ہوئے) یک نہ شُد دو شُد۔

بیوی: توبہ آپ تو بوکھلا دیتے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں۔ خط لکھ رہی ہوں۔ بچے کو چپ کیوں کر کرا سکتی ہوں؟ نامراد چپ ہو جا۔ خون نکل آیا تو کیا قیامت آ گئی۔ ابھی آ رہی ہوں دو سطریں لکھ لوں۔

(میاں کراہتا ہے۔ بے سُرے گانے اور بچے کے رونے کی آواز جاری ہے)

میاں: ختم نہیں ہوا خط؟ جانے کیا دفتر لکھنے بیٹھ گئی ہو۔

بیوی: ابھی ہوا جاتا ہے ختم۔

(اس غُل میں ایک فقیر کی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے)

فقیر: بال بچے کی خیر۔ راہِ مولا کچھ مل جائے فقیر کو۔

میاں: (کراہ کر) بس ان ہی کی کسر رہ گئی تھی۔ ہوں۔

بیوی: تو اب میں تو اسے بُلا کر لے نہیں آئی۔

میاں: ارے تو خدا کے لیے اسے رخصت تو کر آؤ۔

بیوی: او للّو! ارے او للّو!

(للّو ہاون دستے میں رِیٹھے کُوٹنے شروع کر دیتا ہے۔ بے سُرے گانے میں بچے کے رونے اور فقیر کی صدا اور ہاون دستے کی دھمک اور شامل ہو جاتی ہے)

میاں: ہائے توبہ، توبہ، ہائے۔

بیوی: ارے نامراد رِیٹھے پھر کُوٹ لینا۔ پہلے اس فقیر کو رخصت تو کر لے (للّو ریٹھے کُوٹنے میں بیوی کی آواز نہیں سُنتا)

میاں: (جلدی جلدی کراہتا ہوا گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا ہے)۔ میری ٹوپی اور شیروانی دینا۔

بیوی: ٹوپی اور شیروانی!!

میاں: ہاں میں دفتر جا رہا ہوں۔ ابھی دفتر جا رہا ہوں۔

بیوی: ہے ہے وہ کیوں؟

میاں: آرام اور سکون کے لیے۔

سوالات

1۔ سبق کا متن مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

(الف) روزانہ آرام وسکون نہ کیا جائے تو اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

(ب) بیماری کے باوجود میاں دفتر جانے کے لیے کیوں تیار ہو جاتا ہے؟

(ج) اس ڈرامے سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

(د) بہت زیادہ شور غل بھی ماحولیاتی آلودگی کا سبب بنتا ہے۔ شور کی اس آلودگی سے صحت پر کیا اثر پڑ رہا ہے؟

2۔ واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیے۔

وقت۔ ضرورت۔ ہدایات۔ غذا۔ طبیعت۔

3۔ مندرجہ ذیل غلط جملوں کی درستی کیجیے۔

(الف) میرے ابّو دفتر سے واپس لوٹ آئے ہیں۔

(ب) ڈاکٹر نے مریض کو دوائی دی۔

(ج) شور وغل سے صحت پر ناخوش گوار اثر پڑتا ہے۔

(د) میرے پیٹ میں درد ہو رہی ہے۔

(ہ) یہ میز پرانا ہو چکا ہے۔

(و) نوکر نے کمرے میں جھاڑو دیا۔

☆O☆

مولوی عبدالحق

(1870ء-1961ء)
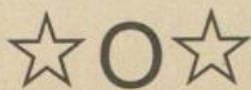
نام دیو۔ مالی

نام دیو مقبرۂ رابعۂ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حُسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اُونچی ذات والوں میں

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالیؔ
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اُس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا لِکھتے لِکھتے کبھی نظر اُٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اُس کا تھانوٗلا صاف کر رہا ہے۔ تھانوٗلا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رُخ سے پودے کو مُڑ مُڑ کر دیکھا پھر اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اُسی وقت ہوتا ہے جب اُس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اُسے دیکھا کرتا۔ مگر اُسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اُس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی

کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح اُن کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ اُن کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خُوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، اُن کو پیار کرتا، جُھک جُھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا اُن سے چپکے چپکے سے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اُس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ اُن کو توانا اور تازہ دیکھ کر اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کِسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اُسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اُسے بچالیتا اور جب تک وہ تن درست نہ ہو جاتا اُسے چین نہ آتا۔ اُس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اُسے جڑی بُوٹیوں کی بھی شناخت ہوگئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اُسے بڑی مہارت تھی۔ دُور دُور سے لوگ اُس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بُوٹیاں لاکر بڑی شفقت اور غور سے اُن کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اُسے علاج کے لیے بُلا لے جاتے۔ بلا تامّل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھونس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں با قاعدہ، تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر، جھاڑنا بُہارنا صبح شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم خان فینسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا

سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہوگئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باؤلیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہوگئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مُرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا اور وہ دُور دُور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اُٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور اُنھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اُس نے راتوں کو بھی پانی ڈھوڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا، یُوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اُسے انعام دینا چاہا۔ اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اُس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو وہ تو ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش گوار آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظمِ تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغ بانی مشہور تھا۔ مقبرۂ رابعۂ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے، مدت سے ویران اور سُنسان پڑا تھا، وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکاڑ سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سر سبز، شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دُور دُور سے لوگ اُسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے۔ اُسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے

گئے۔ شاہی باغ آخر کار شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگران کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، طہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ اُن کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اُپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اُس نے نہ فنِ باغ بانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اُس کے پاس کوئی سَند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دُھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اُس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اُسی کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سیندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سیندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اُس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ اُسے کیا پتا تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلڑ اُس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے بس ہو گیا۔ آخر کار اسی میں جان دے دی۔

وہ بہت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور منکسر المزاج تھا۔ اُس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جُھک کے ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی حد سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کار کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دُھوپ ہو یا سایہ وہ دن رات برابر کام کرتا رہا۔ اُسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اُسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اُسے کسی سے بَیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام کرتا، آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اُسے یہ کبھی احساس نہ ہوا کہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اُس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بُرا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اُس صلاحیت کو درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔

(چند ہم عصر)

سوالات

1۔ سبق کے متن کو مدِ نظر رکھ کر خالی جگہیں پُر کیجیے۔

الف۔ سچائی، نیکی، حُسن کسی کی .... نہیں۔

ب۔ ڈھیڑ ذات کو .... خیال کیا جاتا ہے۔

ج۔ بے مزہ کام، کام نہیں، .... ہے۔

د۔ نام دیو کے کوئی .... نہ تھی۔

ر۔ نام دیو کو .... کے علاج میں مہارت تھی۔

ز۔ عام طور پر انسان .... واقع ہوا ہے۔

2۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

الف۔ کسی پودے کو کیڑا لگ جاتا تو نام دیو کیا کرتا؟

ب۔ نام دیو بچوں کے علاج کے لیے ادویات کہاں سے حاصل کرتا؟

ج۔ پانی کی قلت کے زمانے میں نام دیو پودوں کو کیسے سیراب کرتا؟

د۔ مصنف نے نام دیو کو انعام کی پیش کش کی تو اس نے کیا کہہ کر انعام قبول کرنے سے انکار کر دیا؟

ر۔ نیکی کب تک نیکی رہتی ہے؟

ز۔ نام دیو کی موت کا واقعہ لکھیے۔

3۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

4۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے۔

میز۔ ڈول۔ حوض۔ کیچڑ۔

5۔ اِعراب کی مدد سے تلفُّظ واضح کیجیے۔

شناخت۔ روش۔ مستحق۔ اعتبار۔ یورش۔ بساط۔

6۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

مصروف۔ بیمار۔ درست۔ توانا۔ پاک۔ کاہل۔ ویران۔ نیکی۔

7۔ مندرجہ ذیل کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

آفت ٹوٹ پڑنا۔ اوسان خطا ہونا۔ بے دم ہو جانا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا۔ خبر ہونا۔

8۔ مندرجہ ذیل اقتباسات کی تشریح کیجیے۔

الف۔ باغ کے داروغہ........... صلے کی پروا۔

ب۔ ایک دن نہ معلوم........... جان دے دی۔

9۔ دو جملے دیکھیے۔

(i) مصدق محنتی ہے۔ (ii) مریحہ ذہین ہے۔

پہلے جملے میں مصدق کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ محنتی ہے۔ اسی طرح دوسرے جملے میں مریحہ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ ذہین ہے۔ قواعد میں جس کے متعلق بتایا جائے اُسے مبتدا کہتے ہیں جب کہ کسی کے متعلق جو بات بتائی جائے اُسے خبر کہتے ہیں۔ گویا ''مصدق'' اور ''مریحہ'' مبتدا ہیں جب کہ ''محنتی'' اور ''ذہین'' خبر ہیں۔ دونوں جملوں کا آخری لفظ ''ہے'' فعل ناقص ہے۔

ایسا جملہ جو مبتدا، خبر اور فعل ناقص پر مشتمل ہو، جملہ اسمیہ کہلاتا ہے۔

اب مندرجہ ذیل جملوں کو غور سے پڑھیے اور دی گئی مثال کی روشنی میں جدول کی خانہ پُری کیجیے۔

(الف) علامہ اقبال ؒ قومی شاعر ہیں۔ (ب) قائداعظم ؒ مدبر سیاست دان تھے

(ج) وادی دل کش ہے۔ (د) پہاڑ بلند و بالا ہیں۔

(ہ) مکان دومنزلہ تھا۔ (و) باغ خوب صورت ہے۔

(ز) مسجد قابل دید تھی۔

مبتدا	خبر	فعل ناقص
علامہ اقبال	قومی شاعر	ہیں

کرنل محمد خاں
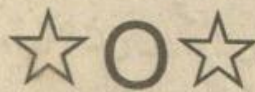
(1920ء-2001ء)

سِفارِش طَلَب

آغا میرے بے تکلف دوست ہیں۔ اصول کے بندے ہیں بلکہ اپنی اصول پرستی کے لیے بدنامی کی حد تک مشہور ہیں۔ پچھلے دنوں میں ان سے عارضی طور پر ناراض سا تھا۔ لیکن وہ ایک شام بہ ہمی بے تکلفی آوارد ہوئے اور میری ظاہری سرد مہری کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے ملازم کو حسبِ معمول چائے کا حکم دیا اور مجھ سے ذرا رازدارانہ لہجے میں کہنے لگے:

''چودھری! ایک ضروری کام سے آیا ہوں اور کام یہ ہے کہ ایک جگہ ڈاکا ڈالنا ہے۔ ساتھ دو گے''؟

آغا جیسے دیانت زدہ شخص کی طرف سے ڈاکے کی دعوت! میں نے سوچا ضرور اس میں کوئی پیچ ہے۔ کہا:

''ہوش میں ہو آغا؟ معلوم ہے ڈاکا کیسا فعل ہوتا ہے؟ اور پھر دعوت دیتے حیا نہیں آتی؟ ڈاکو بناتے ہو؟

آغا کرسی پر دراز ہو کر بولے:

''بس۔ بس۔ بس اتنا کافی ہے۔ خفامت ہو کل تم نے مجھے ڈاکے کی دعوت دی تھی۔ آج میں نے دے دی۔ میں تمھاری نہ مانا' تم میری نہ مانو۔ جھگڑا ختم۔ ہاں ذرا چائے جلد نکلے۔'' مجھے سچ مچ شک ہوا کہ آغا کا دماغ چل گیا ہے۔ میں نے کہا:

تم کیسی باتیں کرتے ہو آغا؟ میں نے تمھیں ڈاکے پر اُکسایا؟''

بولا : ''ہاں تم نے اپنے مولوی زادے کی سفارش نہیں کی کہ اسے کلرک بھرتی کر لو؟''

اب سفارش تو میں نے ضرور کی تھی۔ لیکن یہ ڈاکے کا کیوں کر ہوا؟

لیکن میں کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ بولے:

''دیکھو چودھری! سفارش کر کے تم نے کسی دوسرے کا حق اپنے مولوی کے لونڈے کو دلانا چاہا تھا' اور کسی کا حق چھیننا ہی ڈاکا ہے۔ اس ڈاکے سے تمھیں بچالیا اور تم اس روز سے منہ پھلائے بیٹھے ہو۔'' تو یہ ساری تمہید آغا نے ہمیں زِچ کرنے کو اُٹھائی تھی' اور جب ہم نے ایک لمحے کے لیے ٹھنڈے دل سے سوچا تو محسوس ہوا کہ آغا سچا ہے اور ہم زِچ ہو چکے ہیں اور پھر جتنا مزید سوچا اتنی ہی پرانی سفارش جو کی تھیں یا مانی تھیں' یاد آ گئیں۔ گویا وہ تمام ڈاکے جن میں شریک ہوا تھا، آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ آغا نے ہمارے منہ پر ہوائیں اُڑتے دیکھیں تو بولے:

''ندامت محسوس کرتے ہو واللہ ضرور کرو آئندہ کے لیے توبہ بھی کرو۔''

یہ عرصے کی بات ہے لیکن اب بھی جب کبھی سفارش کا ذکر چھڑتا ہے یا کوئی سفارش طلب آ نکلتا ہے تو معلوم ہے کسی ڈاکے کی واردات ہوگئی ہے یا ہونے والی ہے۔ لیکن کاش آغا نے میرے علاوہ، باقی سفارش طلبوں کی اصلاح بھی کر دی ہوتی۔ ان ڈاکوؤں میں کسی طرح کی کمی آتی دکھائی نہیں دیتی۔ دنیا میں وبائیں پھوٹ نکلتی ہیں اور آخر میں تھم جاتی ہیں، جنگیں چھڑتی ہیں اور آخر میں صلح ہو جاتی ہے لیکن سفارش کا سیلاب ہے کہ ہر وقت طغیانی پر ہے اور جس قدر روکو اور تند ہوتا ہے۔ غالب کے زمانے میں بھی اگر سفارش طلبوں کی یورش کا یہی عالم ہوتا جو آج ہے تو وہ اپنا معروف شعر ذرا مختلف طور پر کہتے۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے سفارش تو یہ ہوتی ہے رواں اور

سفارش کے جراثیم مکھی، مچھر یا چوہے نہیں پھیلاتے، اپنے اقربا اور دوست پھیلاتے ہیں، اچانک ایک اجنبی رقعہ لے کر آتا ہے۔ جس پر ''اشد ضروری'' اور ''بصیغۂ راز'' جیسے تاکیدی الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔ آپ خط کھولے بغیر ہی سمجھ جاتے ہیں کہ چچا جان کی جناب سے ایک اور سفارش نازل ہوئی ہے اور حامل رقعہ یوں لگتا ہے جیسے سفارش کے طاعون کا ایک اور چوہا گرا ہو۔ آپ لفافہ کھول کر پڑھتے ہیں تو لکھا ہے:

''عزیز من! حامل رقعہ شیخ حاضر دین میرے ایک دوست کے داماد ہیں۔ بڑے

شریف آدمی ہیں۔ اتفاق سے ان پر چینی بلیک کرنے کا مقدمہ بن گیا ہے جس کی تفتیش مسٹر انصاری کر رہے ہیں، جو بد قسمتی سے دیانت دار قسم کے آدمی ہیں اور کسی کی سُنتے ہی نہیں۔ مگر پتا چلا ہے کہ تمھارے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ ہم جماعتوں کا ایک دوسرے پر بڑا حق ہوتا ہے۔ اسی وقت مسٹر انصاری سے ملو اور شیخ صاحب کی گلو خلاصی کرا دو ورنہ شریف آدمی مفت میں جیل میں سڑتا رہے گا۔ آخر کون ہے جو آج کل بلیک نہیں کرتا؟ والسلام"

کتنے بھولے ہیں آپ کے چچا جان۔ چوں کہ حاضر دین ان کے دوست کے داماد ہیں۔ لہٰذا چور ہوتے ہوئے بھی چور نہیں بلکہ شریف آدمی ہیں اور اتنے شریف کہ جیل میں دم رکھا تو تو گل سڑ جائیں گے۔ وہ صرف چینی کی بوری میں پھلتے پھولتے ہیں اور ہاں کتنا پاجی ہے یہ مسٹر انصاری جو دن دہاڑے دیانت داری سے کام کرتا ہے۔ رہے آپ تو اگر شیخ حاضر دین کو اس ظالم انصاری کے پنجے سے آزاد نہ کرایا تو آپ سا نالائق بھتیجا تیسری دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔---- دراصل چچا جان اتنے بھولے نہیں جتنے خطرناک ہیں۔ ایسے جراثیم بردار چچا جان کو اولین فرصت میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی سے نہلانا چاہیے کہ اگر وہ خود اس غسل سے بچ بھی نکلیں تو ان کے جراثیم تو تلف ہو جائیں۔

چند سفارش طلب بلیک میل کی تکنیک استعمال کرتے ہیں۔ آپ سکون سے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں کہ سواری رکتی ہے۔ ایک حضرت ہنستے کھیلتے کار سے اترتے ہیں اور نہایت بے تکلفی سے آپ کو دور ہی سے سلام پھینکتے ہیں۔ قریب آ کر صرف ہاتھ ہی نہیں ملاتے، معانقے کے لیے بازو بھی کشادہ کرتے ہیں۔ (معانقے سے بچنا آپ کی قسمت یا ہاتھ کی صفائی پر منحصر ہے) بچوں کو نام سے بلا کر ایک ایک کو گود میں لیتے ہیں۔ اپنی عمر کے مطابق بھابھی یا بٹیا کا مزاج دریافت کرتے ہیں اور اگر وہ باہر نہیں آتیں تو حیرت سے کہتے ہیں۔ "ارے مجھ سے پردہ! چچا سے!؟" اندر جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ کے حواس ابھی بجا ہیں تو کوئی بہانہ کر دیتے ہیں کہ اس وقت گھر میں نہیں۔ ہمسائی سے ملنے گئی ہیں---- لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور آپ کو یہ معلوم نہیں کہ یہ ذات شریف ہیں کون؟ اور اس بے تحاشا بے تکلفی کے بعد آپ ان سے پوچھنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ آپ کی زبان سے صرف اتنا نکلتا ہے کہ "مزاج اچھے ہیں" آپ کے جواب میں وہ نہ صرف اپنے مزاج کی داستان

سناتے ہیں، بلکہ اپنے ریاض، نواز، جمیلہ اور موتی کتے تک کی کیفیتِ مزاج بیان کر دیتے ہیں اور آپ کے تمام رشتہ داروں کے تازہ کوائف بھی پیش کر دیتے ہیں۔ آپ حیرت سے ان کا منہ تکتے ہیں اور ابھی سنبھلنے بھی نہیں پاتے کہ سفارش پیش ہو جاتی ہے۔''

''ہاں بھئی، تو تم نے ابھی تک پوچھا ہی نہیں کہ ہم آئے کیسے ہیں۔ وہ جانتے ہو نا، اپنے مرزا صاحب، ارے جن کے ہاں اپنے حمید کی منگنی ہوئی ہے۔ انھوں نے ٹھیکے کے لیے ٹینڈر دے رکھا ہے اور سنا ہے تم کل صبح ہی یہ ٹینڈر کھول رہے ہو۔ بس یوں سمجھ لو خود میں نے ہی ٹینڈر دیا ہے۔''

آپ حیران ہو رہے ہیں کہ جان نہ پہچان اتنا بڑا جرم اور اس صفائی اور بے تکلفی سے ارتکاب۔ لیکن آپ ابھی سوچ رہے ہوتے ہیں کہ ارشاد ہوتا ہے: ''بھئی کہیں بہت زیادہ قاعدے قانون کے چکر میں نہ پڑ جانا، آج کل یہ عارضہ عام ہونے لگا ہے۔ کوئی بات کہو مانتے ہی نہیں۔ ملک، قوم، پاکستان کو رونا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے تمھارا دماغ ابھی سلامت ہے۔ اخ اخ اخ'' اور زور سے آپ کا کندھا تھپکاتے ہیں گویا پیشگی آپ کو بتایا جا رہا ہے کہ آپ کا انکار دیوانگی کی علامت ہوگی اور اس کے بعد اگر واقعی عذر کرتے ہیں تو حضرت ایک اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں نہ کہتا تھا، یہ بیماری آج کل عام ہے ہر بات میں پاکستان۔ ارے میاں، پاکستان کا اللہ مالک ہے، اس طرح دنیا کے کام نہیں چلتے۔ ہم تم دنیا دار آدمی ہیں۔ ہم قائد اعظم تھوڑے ہی ہیں۔ لو ہاں کر لو۔''

سادہ لفظوں میں اس فلسفے کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان کو چلانے کی تمام ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔ دیانت داری فقط قائد اعظم کے لیے ہے اور ہمارا کام صرف دنیا داری ہے۔ لفظ دنیا داری تین اجزا کا مرکب ہے۔ چوری رشوت اور خویش پروری کا۔ ایسے سفارش طلبوں سے گلو خلاصی کا موثر طریقہ ایک ہی ہے کہ آپ مسکرا کر ان کا بازو تھامیں، انھیں گھر کے دروازے تک لے جائیں اور ایسا کرتے ہوئے انھیں کھینچنے یا گھسیٹنے کی ضرورت پڑے تو یہ ضرورت بھی پوری کریں اور آخر پھاٹک پر پہنچ کر خندہ پیشانی سے خدا حافظ کہیں اور پھاٹک سے باہر کر دیں اور لازم نہیں کہ اس عمل میں فقط ہاتھوں سے کام لیں۔

کلامِ اقبال ہر جگہ امرت دھارا کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ چناں چہ سفارش طلبوں کے ایک حلقے کا انحصار بھی اقبال کے استعمال پر ہے۔ ایک دن چھٹی کے روز چمن میں بیٹھے دھوپ میں ستا رہے تھے کہ ایک حضرت جو دُور ہی سے بڑے نستعلیق سے نظر آرہے تھے آوارد ہوئے اور نظریں چار ہوتے ہی فرمایا:

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
محبت حسنِ عالم گیر ہے مردانِ غازی کا

انداز سے پتا چل گیا کہ حضرت سفارش طلب ہیں لیکن گھر آئے تھے، کرسی پیش کی اور شانِ نزول دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ جناب نے عساکرِ پاکستان کے لیے بڑی بے نظیر کتاب لکھی ہے۔ ''مردِ مجاہد'' اور خاکسار سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ فوجی فنڈ سے صرف دس ہزار نسخے خریدیں اور فوج میں تقسیم کر کے ثوابِ دارین حاصل کرے۔ کتاب کا ہدیہ فقط پندرہ روپے فی جلد ہے۔ گویا ڈیڑھ لاکھ کی معمولی رقم میں ساری فوج کی مع کمانڈر انچیف کے عاقبت سنور جائے گی ---- یہ کہہ کر مولانا نے اپنے تھیلے سے قصہ سسّی پنوں کے حلیے کی ایک بے جلد کتاب میرے سامنے رکھ دی۔ کتاب دیکھنے پر میرا صدمہ اس قدر واضح تھا کہ مولانا نے جھٹ کلامِ اقبال میں سے ایک خوراک پیش کی:

نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی کج کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایہ کلاہ داری کی

میں نے کہا: ''قبلہ کتاب میں تو کوئی خرابی نہیں۔ چھپائی دن کی روشنی میں بخوبی پڑھی جاسکتی ہے۔ احتیاط سے ورق الٹے جائیں تو کاغذ بھی نہیں پھٹے گا اور صرف ایک کتاب خریدی جائے تو شاید قیمت بھی برداشت کی جاسکتی ہے۔ خرابی یہ ہے کہ اس خاکسار کو دس ہزار نسخے خریدنے کا اختیار نہیں۔''

فرمانے لگے: لیکن جن کو اختیار ہے وہ تو آپ کے دوست اور رفیقِ کار ہیں۔ ''آپ کی سفارش رد نہ کریں گے۔'' عرض کیا: ''لیکن سفارش کرنا بھی ایسا مستحسن فعل نہیں ہے اور تعجب ہے کہ آپ پیروِ اقبال ہو کر سفارش کے محتاج ہیں۔''

بولے: ''سفارش تو اقبال بھی کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے متعلق فرمایا ہے:

اک مردِتن آسان تھا، تن آسانوں کے کام آیا

عرض کیا: ''قبلہ انھوں نے تو ایک چیونٹی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ سلیمان کے پاس بھی حاجت لے کر نہ جائے۔ شاید وہ شعر بھی آپ کو یاد ہو''۔ بولے: ''یاد ہے مگر اسی لیے سلیمان کے پاس نہیں گیا آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ ہی سے تو نیاز مند کی امیدیں وابستہ ہیں''----- ساتھ ہی آنکھوں میں نم لاکر ذرا رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگے:

''بتا کیا تُو میرا ساقی نہیں ہے''

میں اس گہری جذباتی اپیل کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سُوجھا تو اضطراراً میرے منہ سے نکل گیا:

''مرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے''

اس پر اس نے ایک یاس انگیز نگاہ آسمان پر ڈالی، کتاب سنبھالی اور بھرپور ناراضی کے عالم میں یہ کہتے چل دیے۔

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں!

سفارش طلب سے نبٹنے کے کئی طریقے ہیں۔ بعض آدمی گلوخلاصی کے لیے نہایت فیاضی سے جھوٹا وعدہ کر دیتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں لیکن یہ بزدلوں اور مصلحت کوشوں کا طریقہ ہے۔ آپ ایسا ہرگز نہ کیجیے گا ورنہ آپ کا بھی وہ حشر ہوگا جو ہمارے دوست کرشن چندر کا ہوا اور قصّہ کرشن چندر کا اس کی زبانی سنیے۔

''ایک دفعہ میں لاہور میں ایک معمولی سا ٹیچر بن گیا لیکن گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ پروفیسر ہو گیا ہوں۔ چناں چہ سفارشوں کا تانتا لگ گیا۔ سب سے پہلے ایک پرانے ہم جماعت بلوچ خاں آ گئے بولے: ''منشی فاضل کا امتحان دیا ہے۔ دوسرا پرچہ نکما ہوا ہے۔ پروفیسر قاضی صاحب ممتحن ہیں انھیں کہہ کر پاس کرا دو۔''

پروفیسر قاضی صاحب میری رسائی سے تو سراسر باہر تھے لیکن بلوچ خاں کو ٹالنے اور کسی حد تک اپنی پروفیسری کا رعب جمانے کے لیے کہہ دیا:

''ارے قاضی۔ وہ تو ہمارا لنگوٹیا ہے۔ تمھیں فرسٹ ڈویژن دلوا دیں گے۔ اس

کے بعد بلوچ خاں نے نتیجہ سنا تو فوراً لکھا، اب گاؤں میں کبھی نہ آنا ورنہ مار ڈالوں گا۔ دو ہی دن گزرے تھے کہ میرے ہمسائے پنڈت شو نرائن اپنے بیٹے کی سفارش لے کر آ دھمکے۔ بولے: ''کاکے پرکاش نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ تاریخ کا پرچہ ذرا گڑبڑا گیا ہے۔ شرما صاحب کے پاس پرچہ ہے انھیں اشارہ کر دیجیے گا۔''

اشارے سے ظاہر تھا کہ پنڈت جی کے ذہن میں میرے رسوخ کا بلند تصور ہے۔ چناں چہ اس وقت تو کہ دیا کہ فکر نہ کریں پنڈت جی، شرما کے کان پکڑ کر لڑکے کو پاس کرا دوں گا لیکن یہ حقیقت تھی کہ شرما صاحب کے کان میری گرفت سے یکسر باہر تھے۔ بہر حال مجھے معلوم تھا کہ لونڈا فیل تو ہو ہی جائے گا۔ اپنی برات اور کارگزاری دکھانے کے لیے ایک ترکیب نکالی۔ ایک دن پنڈت جی اور پرکاش کو بلا بھیجا اور کسی قدر جلال میں آ کر پنڈت جی سے خطاب کیا:

''واہ پنڈت جی واہ'' آپ نے ہماری خوب کرکری کرا دی۔ شرما صاحب کے پاس گیا تو انھوں نے پرچہ نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور کہا تم خود ہی انصاف سے جو چاہو نمبر دے دو اور پرچہ دیکھتا ہوں تو اوٹ پٹانگ، لکھا ہے کہ اکبر کے بیٹے کا نام دین الٰہی تھا اور اشوک لاٹھیاں بیچا کرتا تھا۔ جہانگیر کبوتر پالتا تھا اور لارڈ ہیسٹنگز تیز دوڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ہجے غلط اور املا خراب، خدا جانے یہ لونڈا سارا سال کیا کرتا رہا ہے؟''

اس پر ہماری کارگزاری سے مطمئن ہو کر پنڈت جی نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور پرکاش کے رسید کرتے ہوئے فرمایا: ''کم بخت تاش کھیلتا رہا ہے اور کیا کرتا رہا ہے؟''

لیکن جب کچھ روز بعد نتیجہ نکلا تو پرکاش پاس ہو گیا اور پھر باپ کا ڈنڈا لے کر میری تلاش میں پھرنے لگا۔

سفارش طلب سے نبٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے چور سمجھا جائے اور اس کے ساتھ چور کا سا سلوک کیا جائے۔ جونہی اس کے منہ سے سفارش کا کلمہ نکلے آپ سر پر باہیں رکھ کر ''چور ہے، چور ہے'' چلانا شروع کر دیں۔ ہمسایے اکٹھے کر لیں۔ قریب فون ہے تو پولیس کو اطلاع کریں بلکہ فائر بریگیڈ کو بلانے کی کوشش کریں۔ سائرن بجائیں اگر سفارش طلب بھاگنے کی کوشش کرے تو اس سے گتھم گتھا ہو جائیں اگر آپ اسے گرفت میں نہ لے

سکیں تو کم از کم اس کی پگڑی یا ٹوپی ضرور نوچ لیں تو پھر اس کا یا اس کی ٹوپی کا جلوس ضرور نکالیں۔ اگر پاکستان میں اس طرح کے دو تین واقعات ہو جائیں اور اخباروں میں چھپ جائیں یا ٹی۔وی پر دکھائے جائیں تو وطنِ عزیز سے سفارش کا چار دن میں قلع قمع ہو جائے۔

(بزم آرائیاں)

سوالات

1۔ سبق کے متن کو مدِ نظر رکھ کر درست جواب پر " (✓) " کا نشان لگائیں تا کہ جملہ مکمل ہو جائے۔

i۔ آغا مصنف سے اس لیے ناراض تھے کہ

(الف) ان کی سفارش ٹھکرا دی گئی تھی۔

(ب) ان کے ساتھ سرد مہری کا سلوک کیا گیا۔

(ج) ڈاکے میں مصنف نے ان کا ساتھ نہ دیا۔

(د) انھیں سفارش کی گئی تھی۔

ii۔ ایک سفارش طلب کے بقول پاکستان چلانے کی ذمہ داری

(الف) افسر شاہی پر ہے

(ب) عوام الناس پر ہے

(ج) دانش وروں پر ہے

(د) اللہ تعالیٰ پر ہے

iii۔ سفارش طلب سے نبٹنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ

(الف) اسے ٹکا سا جواب دے کر رخصت کر دیا جائے

(ب) فیاضی سے جھوٹ بول کر اسے خوش کیا جائے

(ج) اس کو چور سمجھ کر خوب بے عزت کیا جائے

(د) اس کی سفارش مان لی جائے

2۔ مصنف کے دوست آغا نے سفارش کو ڈاکا ڈالنے کے مترادف کیوں کہا ہے؟

3۔ سفارش طلب کی بلیک میلنگ کا کیا انداز ہوتا ہے؟

4۔ مصنف نے سفارش طلبوں سے نبٹنے کا کیا طریقہ بتایا ہے؟

5۔ کرشن چندر کا سفارش طلبوں سے نبٹنے کا طریقہ کیوں کر غلط ہے؟

6۔ سبق ''سفارش طلب'' سے ہمیں کیا اخلاقی سبق ملتا ہے؟

7۔ مندرجہ ذیل نثر پاروں کی آسان اردو میں تشریح کیجیے۔

(الف) سادہ لفظوں میں اس فلسفے-----ہاتھوں سے کام لیں۔

(ب) سفارش طلب سے نبٹنے-----قلع قمع ہو جائے گا۔

8۔ مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کریں۔

وارد ہونا۔ ماتھا ٹھنکنا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا۔ منہ پھیلانا۔ رن پڑنا۔ محشر بپا ہونا۔ گتھم گتھا ہونا۔ دماغ چل جانا

9۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفُّظ اِعراب کی مدد سے واضح کریں۔

سفارش۔ عارضہ۔ کج کلاہی۔ مستحسن۔ تنزل

☆O☆

ڈاکٹر سیّد عبداللہ
(1906ء-1986ء)

سائنس اور مذہب کے فاصلے

اس وقت ایک اہم مسئلہ، مشرق اور مغرب دونوں میں، عام انسان کے لیے شدید توجہ اور بحث کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ سائنس کی برق رفتار ترقی کی صُورت میں دین و مذہب بلکہ خود انسان کا مستقبل کیا ہے؟ ہمارے یہاں کا ایک عام آدمی سائنس کی ترقی کو ان ایجادات کے پیمانے سے ناپتا ہے جو ٹیکنالوجی نے ہمیں دی ہیں اور ان میں بعض بلکہ بیشتر ہم سب کے لیے باعثِ راحت و سہولت بھی ہیں، مگر سائنس کی ترقی کا ایک رُخ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ فکرِ انسانی پر اثر انداز ہو کر معاشرت، کلچر اور سوسائٹی کے رویوں پر بھی گہرا اثر ڈال رہی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر دنیا بھر میں مجلسی نظام درہم برہم ہو رہے ہیں۔ اقدار کے سلسلے بکھر رہے ہیں اور جو چیز کل تک اچھی تھی، آج اس کا درجہ یا تو پست ہو رہا ہے یا بالکل فرسودہ اور ہیچ سمجھی جا رہی ہے۔ ان ہی میں اخلاقی اور مذہبی اقدار بھی شامل ہیں اور ایٹمی توانائی کے معجزوں اور مریخ و قمر پر انسان کی یلغاروں نے تو سب کو ششدر اور حیرت زدہ کر رکھا ہے۔

ان حالات میں مغرب کے ادیبوں میں (اور مشرق میں بھی) کبھی کبھی یہ فریادِ تشویش سنائی دیتی ہے کہ سائنس اگر ہلاکت کے سامان یونہی بڑھاتی رہی تو معلوم نہیں انسان کا کیا ہوگا۔ جوہری توانائی کے ان ذخیروں کے ہوتے ہوئے جو سائنس دانوں نے تیار کر کے سیاست دانوں کے ہاتھ میں دے دیے ہیں، دیوانگی و رقابت اور جنگلی جنوں کی ایک خفیف سی لہر بھی اس جہانِ آب و گل اور اس کے کوہ و صحرا کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے، تو ایسے حالات میں ہمارا کیا ہوگا؟ ہمارے بال بچوں کا کیا ہوگا؟ ہمارے بال روموں اور کلبوں کا کیا ہوگا؟ ہمارے مے خانوں اور ہمارے مے کدوں کا کیا ہوگا؟ غرض ابنِ آدم اپنی ہی ذہانت سے پیدا کی ہوئی ایجادات کے ہاتھ سے پریشانی کے عالَم میں ہے اور اس پریشانی کا

پتا ان فلسفیانہ نظریوں اور ادبی دبستانوں سے چلتا ہے جو اس وقت یورپ اور امریکا میں بھکے بھکے خیالات اور بکھری بکھری باتوں کے ذریعے سے انسانی ذہن وقلب کی ترجمانی کررہے ہیں۔ یوں ظاہر میں لبوں پر مسکراہٹ بھی ہے۔ رسالہ "ٹائم" اور رسالہ "لائف" میں ہر عورت ہنستی دکھائی جاتی ہے اور ہر مرد فرحاں وشاداں معلوم ہوتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ دل سب کے پریشان ہیں اور ہر شخص اس خوف ناک ساعت سے ڈر رہا ہے جس کا خدشہ سیاست اور سائنس کی یکجائی نے پیدا کردیا ہے۔

ہم مشرقی لوگ تو شاید صرف تقلید کے جُرم میں مارے جائیں گے۔ پھر بھی مسئلہ سب کے لیے قابلِ غور ہے اور مغرب کی طرح مشرق کے اہلِ فکر کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے۔ مَیں چند روز ہوئے (ایک) رسالہ پڑھ رہا تھا، اس میں پروفیسر ایرک ویل (ERIC WEIL) نے یورپ کے سیاسی اور فلسفیانہ فکر پر لکھتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ فلسفہ اور سیاست دونوں اس اطمینان کی بحالی میں ناکام ہوچکے ہیں، جس کی انسان کو ہر حال میں ضرورت ہے۔ لہٰذا اب ایسا ادب پیدا کرنا چاہیے جو انسان کو قدیم ابتدائی انسان کی سی خوشیوں سے مالا مال کردے۔ چنانچہ مِتھ (MYTH) اور فِکشن (FICTION) کو ان سب پریشانیوں کا علاج بتایا ہے، جن میں اس وقت یورپ اور امریکا کا انسان مبتلا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ مقالہ نگار مذکورہ نے دین کو قابلِ اعتنا کیوں خیال نہیں کیا، مگر میرے نزدیک وجہ ظاہر ہے، وجہ یہ ہے کہ مغربی ذہن ایک زمانہ ہوا یعنی کئی صدیاں ہوئیں، مذہب سے بیزار ہوکر مذہب کو اپنے نظام سے خارج کرچکا ہے۔ مگر جنابِ من! ہم تو ابھی تک دین کو مانتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ اس گئی گزری حالت میں دین ہمارے لیے سرمایۂ اطمینان ہے اور ہم سائنسی لحاظ سے ترقی یافتہ نہ ہونے کے باوجود ان قلبی پریشانیوں میں مبتلا نہیں جن کی ہولناک چیخ مغربی ادبوں میں اس وقت سنائی دیتی ہے۔ لہٰذا کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم مشرق سے مغرب کے نام اپنا پیغام پہنچائیں اور اس سوال کا شافی جواب دیں کہ انسان کا مستقبل، سائنس کی ترقی کے باوجود، چند شرطوں اور پابندیوں کے ساتھ محفوظ ہی نہیں بلکہ شان دار ہوسکتا ہے اور اگر ان شرطوں پر ایمان داری سے عمل کیا جائے تو انسان

کی یہ ارضی جنت ہمیشہ ہمیشہ آباد اور پھلی پھولی رہ سکتی ہے، تا آنکہ خود خدائے حیّ وقیوم کو کوئی اور جنت آباد کرنے کے لیے اس کو مسمار کرنے کا خیال نہ آئے۔

انسان کے مستقبل کے لیے مَیں جن شرطوں کا ذکر کر رہا ہوں، وہ یہ ہیں کہ مشرق و مغرب کے انسان یہ مان لیں کہ خُدا ہے، اس کا رسول برحق ہے، جزا وسزا کا اصول عدل ونَصَفَت ہی کے لیے نہیں، انسانی خوش حالی اور ترقی کا بھی ضامن ہے اور آخر میں یہ بھی کہ قیامت ضرور آئے گی اور موت کے بعد بھی اعمال کا حساب ہوگا۔ اِن اُصولوں کا عقیدہ اور عمل توازن کی ضمانت بن سکتا ہے۔ آپ کہیں گے ہائیں! فلسفے اور سائنس کی باتوں میں یہ مُلّایانہ پیوند۔؟ میں کہتا ہوں آپ کا طعنہ قبول، مگر راہِ نجات یہی ہے اور غور وفکر کے راستے سے بھی اسی نیتجے پر پہنچا ہوں کہ سائنس اور دین کا ملاپ ضروری ہے، اخلاق اور دین کا ملاپ ضروری ہے، ادب اور دین کا ملاپ ضروری ہے۔ اپنی دلیل کو طُول کیوں دوں، کُل زندگی اور دین کا ملاپ، فرد واجتماع دونوں کی خوشحالی اور ترقی کے لیے اور دنیا اور مافیہا کے سود بہبود کے لیے ناگزیر ہے۔

خوش قسمتی سے دنیا میں اس وقت ایک ایسا ملک اور ایک ایسی قوم بھی ہے جس کے کل نظامِ زندگی کی بنیاد دین پر قائم ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اس قوم میں کمزوریاں بھی ہوں گی، اس کے کچھ لوگ دین کا نام مصلحت کی خاطر یا ریاکاری سے لیتے ہوں گے۔ ان میں بعض متشکک ہوں گے اور بعض بے عمل۔ مگر یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس قوم نے اس عقل پرست اور دین دشمن دنیا کے اندر جو دین کو ایک کارِ فضول اور روحانیت کو ایک خیالِ باطل سمجھتی ہے، کسی شرم وحجاب کے بغیر اپنے اس محکم عقیدے کا اعلان کر ہی دیا ہے کہ ہمارا کُل نظامِ زندگی دین پر قائم ہے اور خُدا کی اس زمین پر انسانوں کی بادشاہت نہیں، خدا کی بادشاہت ہے۔ یہ لِلّٰہِ الملک کی وہ روشن تفسیر ہے جس کی اشاعت کا کام اس چھوٹے مگر عظیم ملک سے لیا جانے والا ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

میں پورے یقین واطمینان کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اگر یہ چھوٹی سی قوم یہ بات سمجھ لے کہ دنیا کے فکری رویوں کو درست کر کے ان کے ذہن ونظر اور عمل میں دین واخلاق کی مدد سے توازُن پیدا کرنا اس کا فرض ہے تو مجھے حق الیقین ہے کہ دنیا کے سب کج رویے اور سب غلط نظریے درست ہو سکتے ہیں۔ میں جس قوم کا ذکر کر رہا ہوں، آپ سمجھ ہی چکے ہوں گے کہ اس سے مراد خود آپ اور آپ کی قوم ہے۔ پروفیسر چشتی نے علامہ اقبال کا قول نقل کیا ہے کہ "مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے" حضرت علامہ کے ارشاد کی صداقت میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وقت آ گیا ہے کہ ادب، سائنس، سیاست اور عملی زندگی سبھی کو مشرف بہ اسلام کیا جائے تا کہ ہم خود بھی ان کے بے توازن رجحانات سے بچ سکیں جو ہم میں مغرب اور امریکا کے راستے بڑی سُرعت کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں۔

اس مقصدِ عظیم کے لیے ہمیں اپنے ادب کا بھی مُحاسبہ کرنا ہوگا اور اپنی فکری زندگی کا بھی۔ اور اس بات کو بھی اچھی طرح متعین کرنا ہوگا کہ دین اور سیاست کے ایک ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اور جب ہم دین وسیاست کی یکجائی کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں سیاست سے کیا مُراد لیتے ہیں؟ اور جب ہم دین اور علم اور اقدارِ جدید کے امتزاج کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ کہ اسلام کو فرنگی لباس پہنا دیا جائے یا فرنگی ذہن کو مسلمان بنا دیا جائے؟ یقیناً حضرت علامہ کا مقصد یہ تھا کہ زمانے کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے، نہ یہ کہ اسلام کو زمانے کے کج نظریات کے سانچے میں ڈھال دیا جائے۔

بہر حال یہ بحث الگ ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ توازن پیدا کرنے کا کام ہونا چاہیے۔ یہ آپ ہی کا کام ہوگا کہ آپ پہلے علم اور دین کو ایک جگہ بیٹھنے کا موقع دیں، اس کے بعد غور وفکر کر کے دین اور زندگی کی یکجائی کے لیے راستے ہموار کریں اور ان ہموار راستوں پر اپنے نتائجِ فکر اور ریاضتوں کی شمعیں روشن کریں تا کہ سب لوگ، کسی روک ٹوک کے بغیر بڑھتے چلے جائیں اور اپنی منزل کو پا لیں۔ اس کے لیے طلبہ کو میرا ایک ہی مشورہ ہے اور وہ یہ کہ اس سائنسی اور فلسفیانہ فکر اور علم سے بخوبی واقف ہوں جو بڑی تیزی کے ساتھ دنیا بھر

میں پھیل رہا ہے۔ ہم اس کے بغیر نہ علم کو مسلمان بنا سکیں گے، نہ زندگی کو، نہ سیاست کو اور نہ ادب کو توازن کے راستے پر لا سکیں گے۔

سوالات

1۔ سبق کا متن مدِّ نظر رکھ کر خالی جگہیں پُر کیجیے۔

الف۔ سائنس کی ترقی معاشرت، ثقافت اور معاشرے کے.................. پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔

ب۔ ابنِ آدم اپنی پیدا کی ہوئی.................. کے ہاتھ سے پریشان ہے۔

ج۔ سائنس اور دین کا.................. ضروری ہے۔

د۔ ہمارا کل نظامِ زندگی.................. پر قائم ہے۔

ر۔ خدا کی اس زمین پر خدا کی.................. ہے۔

2۔ مندرجہ ذیل الفاظ میں سے درست لفظ چُن کر خالی جگہیں پُر کیجیے۔

مثال: یقین و اطمینان

مغرب۔ نیچ۔ اطمینان۔ مذہب۔ قلب۔ سہولت۔ حجاب۔ نَصَفَت

یقین و.........، عدل و.........، مشرق و.........، شرم و.........،

دین و.........، فرسودہ اور.........، راحت و.........، ذہن و.........۔

3۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

الف۔ مصنف کی نظر میں مشرق اور مغرب کا اہم مسئلہ کیا ہے؟

ب۔ پروفیسر ایرک ویل کے خیال میں کس طرح کے ادب کی ضرورت ہے؟

ج۔ مصنف مشرق سے مغرب کے نام کیا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں؟

د۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے میں دنیا کے تمام غلط نظریات کی درستی کیسے ممکن ہے؟

ہ۔ دین اور سیاست کی یکجائی کا کیا مطلب ہے؟

4- اس سبق کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

5- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

برق رفتار۔ درہم برہم ہونا۔ فرحاں وشاداں، ریاکاری۔ سرعت۔

6- واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیے۔

مسئلہ۔ مرکز۔ دین۔ مذہب۔ ایجادات۔ اقدار۔ درجہ۔ دلیل۔ اعمال۔ فرد۔ نتائج۔ اخلاق۔

7- مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

مشرق۔ شدید۔ پست۔ خفیف۔ طول۔ توازن۔

8- اِعراب کی مدد سے مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفُّظ واضح کیجیے۔

توجہ۔ مسئلہ۔ مستقبل۔ عمل۔ توازن۔ نجات۔ مصلحت۔ محاسبہ۔ توانائی۔

9- **جو** نیک عمل کرے گا جنت پائے گا۔

جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

مندرجہ بالا جملوں میں نمایاں کیے گئے الفاظ کے ساتھ جب تک ایک اور جملہ نہ لائیں بات پوری نہیں ہوتی۔ ''جو'' اور ''جس نے'' اسمِ موصول کہلاتے ہیں۔

اُوپر دیے گئے دونوں جملوں کا تجزیہ جدوَل کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

اسمِ موصول	صلہ	تکمیلِ صلہ/ جوابِ صلہ
جو	نیک عمل کرے گا	جنت پائے گا
جس نے	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت کی	اُس نے اللہ کی اطاعت کی

اس سبق سے ایسے جملے تلاش کیجیے جن میں اسمِ موصول استعمال کیے گئے ہیں۔

☆O☆

پطرس بخاری
(1898ء-1985ء)
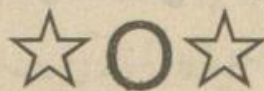
سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہم چاری سے برسبیل تذکرہ کہ بیٹھے کہ "لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں، آپ سحر خیز ہیں، ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے۔"

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھُو کے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اُٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مُکّا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے ابھی سے کیا فکر! جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولا باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آبا و اجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اُٹھی ہو گی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں...... اچھا!...... تھینک یو!...... جاگ گیا ہوں...... بہت اچھا!...... نوازش ہے!— آں جناب ہیں کہ سُنتے ہی نہیں۔ خدایا کس آفت کا سامنا ہے۔ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مُردے کو جلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی سی آواز میں "قُم" کہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا، نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مُردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ تو بھلا ہم سے کیسے ہو سکتا تھا کہ اُٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے۔ پیشتر اس سے کہ بستر سے باہر نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لیمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی، تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا آج پتا چلائیں گے، یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی

میں سے اور روشن دان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبحِ کاذب کی جتنی نشانیاں سُنی تھیں اُن میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی۔ ''لالہ جی !...... لالہ جی!'' جواب آیا۔ ''ہوں''

میں نے کہا: ''آج یہ کیا بات ہے۔ کچھ اندھیرا اندھیرا ہے؟''

کہنے لگے : ''تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟''

کیا تین بجے ہیں؟

''نہیں، کُچھ سات .... ساڑھے سات .... منٹ اوپر تین ہیں۔''

میں نے کہا'' ارے کم بخت، خدائی فوج دار، بدتمیز کہیں کے، میں نے تجھ سے کہا تھا، صبح جگا دینا' یا یہ کہا تھا' کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اُٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظورِ نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے، تین بجے اُٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں، کوئی مذاق ہے لاحول ولاقوۃ۔''

دل تو چاہتا تھا' کہ عدم تشدد و تشدد کو خیر باد کہہ دوں لیکن پھر خیال آیا' کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکا کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے؟ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسبِ معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح دس بجے اُٹھے، بارہ بجے تک ہاتھ منہ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہاسٹل میں وارد ہوئے۔ جوشِ شباب تو تھا ہی۔ اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی۔ طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

اتنے میں آواز آئی۔ ''مسٹر!'' ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس اُنگلیاں وہیں پر رُک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا'' یہ آپ گا رہے

ہیں؟'' (زور ''آپ'' پر)

میں نے کہا۔ ''اجی میں کس لائق ہوں۔ لیکن خیر فرمایئے؟'' بولے۔ ''ذرا...... وہ میں...... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔''

بس صاحب، ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مرگئی۔ دل نے کہا۔ ''او نابکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔'' صاحب' خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ '' خدایا ہم بھی باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔''

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آبیٹھے، دانت بھینچ لیے، نکٹائی کھول دی، آستینیں چڑھالیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد بھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو میز پر ترتیب سے لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔ بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیڈ پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر پندرہ اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانچ سو جواب آیا لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین بجے ہی کیوں نہ اُٹھ بیٹھے لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخرکار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اُٹھنا تو لغویات ہے۔ البتہ پانچ، چھے، سات بجے کے قریب اُٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اُٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہیے۔ کھانا باہر ہی سے کھا کر آئے تھے۔ بستر میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری اپنی قوتِ ارادی کافی زبردست ہے جب چاہیں اُٹھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی ''لالہ جی!'' انھوں نے پتھر کھینچ مارا ''لیس''

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض محسوس ہوتے ہیں تُتلا کے درخواست کی کہ لالہ جی، صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں کل اگر ذرا مجھے چھے بجے یعنی جب چھے بجیں...... جواب ندارد۔ میں نے پھر کہا ''جب چھے بج چکیں تو......سُنا آپ نے؟''

چُپ۔

''لالہ جی!''

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ ''سُن لیا سُن لیا چھے بجے جگا دوں گا۔ تھری گاما پلس فور ایلفا پلس..........'' ہم نے کہا ''ب۔ب۔ب۔ بہت اچھا۔ یہ بات ہے۔''

''توبہ، خدا کسی کو کسی کا محتاج نہ کرے۔''

لالہ جی بہت شریف آدمی ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھے بجے انھوں نے دروازوں پر گھونسوں کی بارش کردی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہولے تو پھر جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک دو منٹ بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہرصورت جیسا کہ میرا فرض تھا، میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اسے اس شکل میں قبول کیا کہ گولا باری بند کردی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمۂ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اُٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا نہیں پتا شاید لحاف اوپر سے اُتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا یا شاید کھانسا کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے کہ پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ مَیں۔ کیا پتا' لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اُس دن چھے دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں مَیں آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل

میں دن بھر یہ شُبہ رہا۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سُنتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو، حد درجے کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صَرف کیا ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا۔ لالہ جی! صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے، جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجب چیز پیدا کی ہے یعنی اگر صبح کی بجائے صبح شام ہُوا کرتی دن کیا بُری طرح کٹا کرتا۔''

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے۔ ''تو میں آپ کو چھے بجے جگا دیا کروں نا۔''

میں نے کہا ''ہاں ہاں، واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بے شک۔''

شام کے وقت، آنے والی صبح کے مطالعے کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ دیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب سرکا لیا۔ اوورکوٹ اور گلوبند کُرسی کی پُشت پر آویزاں کر لیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے، دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیت الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔ صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کُھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے اُن کو ''گڈ مارننگ'' کہا اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا، لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً جاگ اُٹھے۔ دل سے کہا کہ ''دل بھیا، صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے۔ ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔'' دل نے کہا۔ ''اور کیا! تمھارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔'' ہم نے کہا ''سچ کہتے ہو یار۔ یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو اُن کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اُڑاتے ہوں گے اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار

سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔'' ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کرلیا اور پھر سوچنے لگے...... ''خوب۔ تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کرلیں گے۔ اکبر بچارا یہی کہتا کہتا مر گیا لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی...... (لحاف کانوں پر سرک آیا)...... تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں...... بہت ہی پہلے...... یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے...... کیا بات ہے! خداوندانِ کالج بھی کس قدر سُست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اُٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے...... (لحاف سر پر)...... بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے...... (آنکھیں بند)...... تو اب چھ بجے ہیں تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈز ورتھ۔ میں جانوں شیکسپیئر بہتر ہوگا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں ورڈز ورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون اور اطمینان میسر ہوگا اور دل و دماغ نیچر کی خاموش دلآویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے...... لیکن شیکسپیئر...... نہیں ورڈز ورتھ ٹھیک رہے گا...... لیڈی میکبتھ...... دیوانگی...... سبزہ زار...... سنجر سنجر...... بادِ بہاری...... صیدِ ہوس...... کشمیر...... میں آفت کا پرکالا ہوں...... یہ معما اب فلسفہ مابعد الطبعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈز ورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے اس میں نامعلوم کیا بھید ہے!

کالج ہال میں لالہ جی ملے۔ کہنے لگے ''مسٹر! صبح میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی، آپ نے جواب نہ دیا؟''

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا۔ ''لالہ جی یاد نہیں، میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا؟ میں تو پہلے ہی جاگ رہا تھا۔''

بولے ''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن بعد میں .... اس کے بعد! .... کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی، آپ بولے ہی نہیں۔

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہوئے ہیں اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے پھر یکا یک ایک محبوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کے کہا۔ ''ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے، میں اس وقت ...... اے ...... اے نماز پڑھ رہا تھا۔ لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیے اور ہم اپنے زہد و تقویٰ کی مسکینی میں سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔ اب یہی ہمارا روز کا معمول ہو گیا۔ جاگنا نمبر ایک چھے بجے، جاگنا نمبر دو دس بجے، اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔ جب دلِ مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کِیا کرتے تھے، کہ ''ہمارا فرقِ ناز محوِ بالش کم خواب ہو، اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری رُوح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سُریلی اور نازک مغنیہ مسکراتی ہوئی گا رہی ہو:

جاگو موہن پیارے

نصیب یہ ہے کہ پہلے ''مسٹر! مسٹر!'' کی آواز اور دروازے کی دنادن سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور اس چار گھنٹے کے عرصے میں گڑویوں کے گر پڑنے، دیگچیوں کے اُلٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کلیاں اور غرغرے کرنے کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہ ٹھمریاں ہیں۔ یہ اندازہ کر لیجیے کہ ان سازوں میں سُر تال کی کس قدر گنجائش ہے!

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

سوالات

1۔ سبق کے متن کو مدِ نظر رکھ کر درست جواب پر'' (✓)'' کا نشان لگائیں تا کہ جملہ مکمل ہو جائے۔

i۔ مصنف نے لالہ جی کو جگانے کے لیے اس سے کہا کہ:

(الف) وہ سنجیدگی سے پڑھائی کرنا چاہتے تھے۔

(ب) لالہ جی کی سحر خیزی کا امتحان مقصود تھا۔

(ج) سویرے جاگ کر عبادت کرنا تھی۔

ii۔ لالہ جی کے سویرے جگانے پر مصنف

(الف) فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

(ب) جاگے، صرف پہلو بدلا اور دوبارہ سو گئے۔

(ج) صبح کاذب کی علامتیں نہ پا کر لمبی تان کر سو گئے

iii۔ سویرے تین بجے جگانے پر مصنف

(الف) لالہ جی کے شکر گزار تھے۔

(ب) رسمی شکریے کے باوجود سخت ناراض تھے۔

(ج) بُرا ماننے کے باوجود خوش تھے۔

iv۔ اس سبق کا مرکزی خیال یہ ہے کہ

(الف) ہر کام کے لیے منصوبہ بندی ضروری ہوتی ہے۔

(ب) سحر خیزی صحت کے لیے مفید ہوتی ہے۔

(ج) محنت میں عظمت ہے۔

2۔ سبق کا متن مدِ نظر رکھ کر خالی جگہیں پُر کیجیے۔

i۔ صراحی پر رکھا ہوا گلاس ---- کی طرح بجنے لگا۔

ii۔ تین بجے جاگ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ ---- ہیں کوئی مذاق ہے؟

iii۔ ہم ذرا ---- میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

iv۔ ہم میں جو-----کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔

v۔ بڑی-----کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔

3۔ سبق کا متن مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

i۔ لالہ جی کے دروازہ پیٹنے پر کمرے اور مصنف کی جو حالت ہوئی اسے اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

ii۔ لالہ جی کے جگانے پر پہلے روز مصنف کا کیا ردِ عمل تھا؟

iii۔ روزانہ اٹھائے جانے پر مصنف کا روزمرہ کا معمول کیا بن گیا؟

iv۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

4۔ مندرجہ ذیل نثر پاروں کی تشریح کیجیے۔

"وہ حضرت بھی معلوم-----قسمتِ خوابیدہ بھی جاگ اٹھی ہوگی۔"

"اس کے بعد کے واقعات ذرا-----جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں"

5۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفّظ اِعراب کی مدد سے واضح کریں۔

صبح۔ تشدد۔ لغویات۔ معما۔ کاذب

6۔ مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کریں۔

ہوش گم ہونا۔ اوسان خطا ہونا۔ آفت کا پر کالا۔ تیوری چڑھانا

7۔ (i) پچھلے سال میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

(ii) اس سال میں نویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔

(iii) ان شاء اللہ اگلے سال مَیں دسویں جماعت میں ہو جاؤں گا۔

پہلا جملہ گزرے ہوئے زمانے کو، دوسرا موجودہ زمانے کو جب کہ تیسرا آنے والے زمانے کو ظاہر کرتا ہے۔ قواعد کی رو سے گزرے ہوئے زمانے کو فعل ماضی، موجودہ زمانے کو فعل حال جب کہ آنے والے زمانے کو فعل مستقبل کہتے ہیں۔ اس سبق سے فعل حال، فعل ماضی اور فعل مستقبل کی ایک ایک مثال تلاش کر کے لکھیے۔

☆O☆

اختر ریاض الدین

(1936ء)

ٹوکیو کی سیر

''جاپان دیکھیے تو اپریل میں'' سُن سُن کر عمر گزر گئی تھی، اور اب جاپان، بہار اور مَیں ایک ہی وقت میں دوچار ہوئے تھے، اپریل کا مہینا بہاروں کا پیام بر ہوتا ہے، اس ماہ کے شب و روز پھولوں کی خوشبو میں رچے ہوئے ہوتے ہیں اور یہی شوقِ بہاراں مجھے جاپان لایا تھا۔ چیری کے شگوفوں کی لہک میں مَیں سیدھی باہر آ گئی، لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے جو چھو کر دیکھا تو دھچکا سا لگا، شگوفے مصنوعی کاغذ کے تھے، جو اتنا باریک تھا کہ چھُو کر بھی فرق کا مشکل سے پتا چلتا تھا۔ پچاس سال پہلے ٹوکیو ایک وسیع باغ کی طرح شگوفوں سے معمور تھا، لیکن صنعتی ترقی کی بھیانک بدصورتیوں نے چیری کے درختوں کو پیچھے ہٹا ہٹا کر دھوئیں اور کالک سے بھرے ہوئے کارخانے کھڑے کر دیے۔ اب ٹوکیو کے مشہور شگوفے صرف ایک دو مشہور پارکوں میں پائے جاتے ہیں اور غالباً اسی لیے پھولوں کی اس رسیا قوم نے چیری کے اصلی پھولوں کی کمی کو نقلی پھولوں سے پورا کر دیا ہے،۔۔۔۔۔۔ جاپان کا سب سے بڑا آتش فشاں پہاڑ فیوجی یاما ایک پیارا سا سفید ریش بونا معلوم ہوتا ہے، جس کا سر ہمالیہ کے آدھے جسم تک بھی نہیں پہنچتا۔ جاپانی اس کے عاشق اور پرستار ہیں۔ میں جب واپس آنے لگی تو بہت سے ملنے والوں نے مجھ سے کہا کہ جانے سے پہلے ایک مرتبہ فیوجی یاما کی زیارت ضرور کرتی جایئے اِسے دیکھے بغیر آپ کو نروان نہیں مل سکتا۔

پھول ہالینڈ کا پیشہ بلکہ تجارت، لیکن جاپانیوں کے لیے ایک طریقِ زندگی ہے۔ ایک سڑا بُسا قصاب بھی اپنی دکان پر دوچار پھول اٹکائے بیٹھا ہے۔ پھولوں کی سجاوٹ محض ایک فن ہی نہیں بلکہ ایک فلسفہ ہے، گل آرائی اور گلدانوں پر دیوان کے دیوان لکھے ہوئے ہیں۔ شاید ایک جاپانی گلدان چننے میں زیادہ وقت لگاتا ہے، اور دُلھن چننے میں کم۔ سجاوٹ کا ہر نیا طریقہ ایک فلسفۂ حیات کا غماز اور عکاس ہے، حیاتِ فانی اور بقائے ابدی کے راز

ٹہنیوں کے زاویوں پھولوں کے رنگوں اور ڈنڈیوں کی اونچائی نیچائی سے بتائے جاتے ہیں، ترتیبِ گل قلب انسانی کی اندرونی کیفیتیں عیاں کرتی ہے۔ پھولوں کے سالانہ جشن ہوتے ہیں، مختلف پھولوں کے مختلف موسموں میں تہوار منائے جاتے ہیں جن میں نوعمر جاپانی لڑکیاں ناچتی گاتی ہیں، پھولوں کے جلوس نکلتے ہیں۔

مجھے جاپانی گھر دیکھنے کا بہت شوق تھا، کئی لوگوں سے کہا کہ اپنے گھر دکھاؤ مگر وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال گئے۔ جاپانی جب باہر والوں کو بلائیں گے تو ہوٹل یا کلب میں، کبھی گھر پر دعوت نہیں دیتے، شاید ان کا خیال ہے کہ ہم جنگلی ان کے نازک نازک نفیس گھروں کو تہ و بالا کردیں گے، جاپانی صدیوں تک باہر کی دنیا سے کنارہ کش رہے ہیں اور صرف پچھلے اسّی سال سے انھوں نے اپنے معاشرے کے دروازے باہر والوں کے لیے کھولے ہیں لیکن ان کے گھروں کے دروازے ابھی تک بند ہیں۔ خیر مَیں نے بھی ڈھیٹ بن کر ایک گھر تو جھانک ہی لیا، برآمدے اور باورچی خانے میں نہایت عمدہ لکڑی کا فرش ٹائیلوں کی چھتیں، کمروں کے بیچ میں دیواریں ندارد، ہلکے ہلکے کاغذ کے دروازے جو ادھر ادھر کھسک جاتے ہیں اور ہٹائے بھی جاسکتے ہیں، تاکہ کمرا جس ناپ کا بنانا ہو بنالیا جائے، کمرے میں خوب صورت چٹائیاں بچھی ہوئی، کوئی فرنیچر فالتو نہیں، محرابی صورت کا ایک گوشہ عبادت کے لیے مخصوص ہے، جہاں ایک نہایت حسین طغریٰ ٹنگا رہتا ہے، خوب صورت گلدان میں پھول، وہاں گھر والے خاموش بیٹھ کر دعائیں مانگتے ہیں، یا دل و دماغ کو سکون دیتے ہیں، خوش حال گھر والوں میں ایک مغربی طرز کا کمرا ضرور ہوتا ہے جس میں میز کرسیاں اور صوفے ہوتے ہیں۔

پانی کا سمندر تو دیکھا تھا، مگر انسانوں کا سمندر جاپان میں دیکھا۔ یہ انسانی سمندر دفتر کے اوقات میں ٹیکسیوں کاروں، رکشاؤں میں شور مچاتا ہوا بہتا چلا جاتا ہے، ٹیکسیاں شہر کے ہر حصے میں ہزارہا ہیں۔ میں نے امریکا میں بھی ان کی اتنی افراط نہیں دیکھی، موٹروں کی کسی قطار میں عموماً پچاس ٹیکسیاں اور دس ذاتی کاریں ہوتی ہیں اور بڑی سڑکوں پر چھ چھ ایسی قطاریں۔ ہجوم کے وقت ہر دو منٹ کے بعد ٹریفک پانچ منٹ تک رُکا رہتا ہے، یعنی بہتر

یہی ہوتا ہے کہ انسان پیدل چل لے، کار کی رفتار سے پانچ منٹ کا راستا عموماً آدھے گھنٹے میں طے ہوتا ہے اس لیے لوگ دن کے خاص ازدحامی گھنٹوں میں نکلتے ڈرتے ہیں۔ یہ تکلیف صنعتی ترقی کی پہلی قیمت ہے، ٹوکیو میں ٹیکسی شاید دنیا بھر سے ارزاں ہے، روپیا سوا روپیا میں آپ کو ٹیکسی والا کہاں سے کہاں پہنچا دے گا لیکن اس میں دو اور امکانات بھی ہیں، اول تو غلط پتا پر پہنچا دے گا یا پھر عالم فنا میں پہنچا کے دم لے گا۔

ٹوکیو کا سب سے بڑھیا اور تازہ ترین سٹور ایک صنعتی کرشمہ ہے اس کی ایک منزل کے نہایت کشادہ اور طرزِ جدید کے اَیوانوں میں مجلسِ موسیقی جمتی ہے، تھیٹر دکھایا جاتا ہے اور مشہور فن کاروں کی نمائش ہوتی ہے۔ ایک منزل پر چڑیا خانہ ہے اور جس میں ہر قسم کے پالتو جانور خریدے جاتے ہیں۔ میرا وقت تو زیادہ تر تیسری منزل میں صرف ہوا جہاں بانس کے برتن، کانچ اور سیپ کے گل دان، سنہری لاکھ کے عجوبے اور نوادر خریدار کا دامن کھینچتے ہیں۔ بانس جیسے کھردرے اور بے ہنگم مسالے سے کیا کیا باریکیاں پیدا ہو سکتی ہیں! عموماً بانس پر رنگ وروغن نہیں لگایا جاتا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ خود بخود گہرا ہو جاتا ہے۔ ایک بڑھیا قسم کا بانس سیاہ بلکہ گہرا جامنی ہوتا ہے۔ بانس کا فرنیچر ٹوکریاں، لیمپ شیڈ، بانس کی تشتریاں، پلیٹیں، بانس کے گل دان، دل چاہتا تھا کہ گھر سارا بانس سے بنوا لوں اور بانس کے پنگھوڑے میں جھولتی رہوں۔

ٹوکیو میں خرید وفروخت کا مزا اس لیے زیادہ آتا ہے کہ اشیا کی تعداد بہت زیادہ ہے، دکانیں حسین، بیچنے والیاں خندہ لب اور خوبرو، اس پر طرّہ یہ ہے کہ دو پیسے کی چیز کو بھی نہایت نفاست سے نہایت دل کش کاغذ میں ربن سے لپیٹ کر دیں گی، اکثر وہ کاغذ اس قدر حسین رنگ اور نمونے کا ہوتا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ کھول کر اندر نظر نہ ڈالی جائے یا کاغذ رکھ لے اور چیز پھینک دے۔

ایک انگریز نامہ نگار نے لکھا ہے کہ باوجود اس بات کے کہ جاپان کے پاس اپنے قدرتی ذرائع ناپید ہیں، لوہا ہے نہ لکڑی، کوئلہ ہے نہ تیل، پھر بھی اس کی صنعتی پیداوار 1953ء سے لے کر اب تک دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ اس دوڑ میں اس نے روس

اور جرمنی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ جنرل میک آرتھر نے دو احسان جاپان پر کیے ہیں، ایک تو زرعی اصلاح اور دوسری تعلیمی اصلاح۔ زرعی اصلاح کے تحت بڑی بڑی زمین داریاں ختم کر کے چھوٹے چھوٹے کسانوں میں بانٹ دی گئی ہیں، اب ان کسانوں کو آسانی سے قرضے مل جاتے ہیں اور قرضوں کے ساتھ فنی امداد بھی۔ اس کے علاوہ کسان کی اپنی عرق فشانی اور ذہانت سے بھی دیہاتی معیار زندگی بہت اونچا ہو گیا ہے۔

شہروں میں کارخانے کے مزدوروں کی اُجرت گزشتہ سات آٹھ برس میں دگنی سے زیادہ ہو گئی ہے اور اُن کے کام کے گھنٹے کم ہو گئے ہیں، چھٹیاں، انعام، انشورنس اور مفت ڈاکٹری امداد مہیا ہوتی ہے۔ بڑے بڑے مشہور کارخانے دار اپنے مزدوروں سے پدرانہ سلوک کرتے ہیں۔ جاپانی زبان میرے کانوں کو عجیب عجیب آوازوں کا مرکب لگی، جاپانی ''ل'' اور ''ر'' دونوں کو ساتھ ملا کر نہیں بول سکتے۔ مثلاً ہماری رہبر ایک ریل گاڑی کی طرف اشارہ کر کے ہمیں بتا رہی تھی کہ یہ ''جاپانی لیر ہے'' مجھ سے پوچھنے لگیں ''آپ راہول سے آئی ہیں؟'' انگریزی میں پوچھا آپ ''LICE'' کھاتی ہیں۔ میں نے کہا تمھارے منہ میں خاک۔ ہم غریب ہیں پر اتنے بھوکے نہیں۔ جاپانی ہر لفظ کے آگے ''سان'' لگاتے ہیں، جس کے معنی ہیں شریف، ہمارے پاکستانی دوست کا خانساماں ان کو کھڑے کھڑے نوٹس دے کر چلا گیا کہ آپ لوگ اپنے نوکروں کی عزت نہیں کرتے ہیں۔ مجھے خالی نھو کہہ کر پکارتے ہیں، جاپانی مجھے نھو شریف کہتے ہیں، لیکن اس کی خبر نہیں کہ جاپانی بندر کو بھی بندر شریف کہیں گے، اور چائے کو بھی ''چادسان'' کہیں گے۔ ایک اور گڑبڑ یہ ہے کہ ان کی گرامر میں ماضی، حال، مستقبل کی تمیز نہیں ہے۔ ایک انجان کے پلّے یہ نہیں پڑتا کہ دوسرا مر رہا تھا، مر رہا ہے یا مر چکا۔

جاپانی صدیوں سے اپنے جزیرے کی ریاست اور فسادات میں مصروف اور اپنی خود ساختہ علیحدگی میں مگن رہے ہیں۔ اس لیے نئی زبان سیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ پچھلے سو سال سے یورپ اور امریکا سے تجارتی تعلقات قائم ہیں۔ پچھلی جنگ کے بعد امریکا نے دس سال تک اپنی فوجیں یہاں رکھ کر حکومت کی ہے۔ انگریزی زبان کے لیے

بے شمار اسکول دن اور رات چلائے ہیں۔ اس وقت بھی انگریزی سکھانے کی موٹر گاڑیاں گھومتی پھرتی ہیں، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر انگریزی پڑھانے کی جماعتیں ہوتی ہیں لیکن ان سب کے باوجود جاپانیوں نے انگریزی نہ سیکھی، یعنی ٹوکیو جیسے دارالسلطنت میں جہاں سیاحوں کے طفیل بے حساب رونق اور روزگار ہے، ایک قدم اکیلے چلنا مشکل ہے۔ اگر راستا بھول جاؤ تو کوئی بتانے والا نہیں، ٹیکسی والے کو انگریزی نہیں آتی۔ لاکھ سر پٹکو، نہ وہ ہماری سمجھے اور نہ ہم اُس کی۔ ہر دکان پر بنے تُلے سوال کا جواب ''جی'' یا ''نہیں'' اگر ذرا کوئی بات تفصیل سے پوچھنا چاہو تو جب تک اندر دفتر میں سے کوئی ان کا افسر یا مینجر نہ بلوایا جائے، بے بس کھڑے رہیں۔

جاپان کو پہلی جنگِ عظیم کے بعد مشرق کا جنٹلمین یعنی سب سے مہذب ملک قرار دیا گیا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد دنیا کا ظالم ترین قصاب ٹھہرایا گیا۔ ان دونوں مبالغوں کے درمیان کچھ گنجائش ہے اور اگر غور سے تاریخ کے اوراق دہرائے جائیں تو شاید دونوں بیانات سچ ہوں۔ یہ قوم جنگ جُو اور جنگ پرست ہے اور ہمیشہ اس کی نظر ہمسائے کی ملکیت پر رہتی ہے۔ جو ظلم، تشدّد، سفّاکیاں اس نے چین، برما، ہانگ کانگ اور کوریا میں کی ہیں، ان کا حال پڑھنے اور سُننے سے انسانی تہذیب لرز جاتی ہے، اس کے برعکس روزانہ پُرامن زندگی کے دوران میں یہ قوم نہایت بااخلاق اور شیریں مزاج ہے۔ ہندو تو صرف ہاتھ جوڑتے ہیں، یہ قوم سلام کے لیے آدھی جھک جاتی ہے اور اس وقت تک جھکی رہتی ہے جب تک آپ اپنی کمر سیدھی نہ کرلیں۔ مجھے اکثر سڑکوں پر دو عدد کمریں دوہری کھڑی ہوئی ملتی تھیں اور دونوں عدد ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتی رہتی تھیں کہ پہلے کون سی سیدھی ہو۔ اس لطفِ اخلاق کے باعث میری نحیف کمر کئی دفعہ مجھ سے الگ ہو کر چلتی تھی، ایک دفعہ تو اس نے لاہور کا رخ کرلیا اور میں نے بمشکل اس کا رُخ موڑا۔ اس گنجان جزیرے میں جہاں انسان اَچار کی طرح ڈبوں میں بند ہوں اور سب نہایت قریب قریب رہتے ہوں اور تخلیہ اور تنہائی عنقا ہو، وہاں پر ایک دوسرے کے حقوق کا بہت خیال رکھا جاتا ہے مثلاً ٹیلی فون عام پبلک کے لیے جگہ جگہ رکھا ہوا ہے، میں نے لگا ہوا اس لیے نہیں کہا کہ ٹیلی فون کے لیے کھوکھے

یعنی کیبن نہیں ہیں، بلکہ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر کھلے پڑے ہوئے ہیں لیکن کوئی راہ رو دوسرے کی باتیں سُننے کے لیے نہیں رُکتا۔ سب کو اپنے اپنے کام سے غرض ہے۔ یہ مصروف، کارکن اور محنتی قوم ہے ٹھہر کر ٹوہ لینے میں وقت ضائع نہیں کرتی ہے۔ ان لوگوں کی خودداری کچھ تاریخی ورثے میں آئی ہے، کچھ اقتصادی استقامت سے ملی ہے، کسی موقع پر بھی اہلِ حرفت انعام نہیں لیتے۔ نہ ٹیکسی والے نہ ہوٹل کے خادم نہ گھر کی خادمہ۔ یورپ میں ہر قدم پہ انعام دینا پڑتا ہے جو بعض اوقات کھانے کے بل اور ہوٹل کے کرائے کے لگ بھگ جا پڑتا ہے۔ لیکن جاپان میں انعام کی گمشدگی نے سیاحوں کے لیے بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔

(سات سمندر پار)

سُوالات

1۔ سبق کو مدنظر رکھ کر خالی جگہ پر کریں۔

(الف) ٹوکیو ایک وسیع باغ کی طرح .... سے معمور تھا۔

(ب) جاپانی گل دان چننے میں زیادہ وقت لگاتا اور .... چننے میں کم۔

(ج) خوش حال گھرانوں میں ایک .... کا کمرا ضرور ہوتا ہے۔

(د) ٹوکیو کا سب سے بڑھیا اور تازہ ترین سٹور ایک صنعتی .... ہے۔

(ہ) کسی موقع پر .... انعام نہیں لیتے۔

2۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں۔

i۔ ٹوکیو میں اصلی شگوفوں کی کمی کی وجہ کیا ہے؟

ii۔ پھولوں کی سجاوٹ کے نئے طریقے کس بات کے غماز اور عکاس ہیں؟

iii۔ ٹوکیو میں ٹیکسی پر سفر کرتے ہُوئے کیا خطرات لاحق ہوتے ہیں؟

iv۔ جاپانی غیر ملکیوں کو گھر دکھانے سے کیوں گریزاں رہتے ہیں؟

v۔ جاپانی لوگ کن دو حروف کو ملا کر پڑھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں؟

3۔ سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل نثر پاروں کی تشریح کیجیے۔

(الف) ''گل آرائی اور گل دانوں پر.......... پھولوں کے جلوس نکلتے ہیں''

(ب) ''جاپانی صدیوں سے اپنے جزیرے...... جاپانیوں نے انگریزی نہ سیکھی''

4۔ نماز **پڑھنا** ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرض ہے۔

ہمارا **مرنا** اور **جینا** اللہ کی رضا کے لیے ہو۔

جلدی **سونا** اور جلدی **جاگنا** صحت کے لیے مفید ہے۔

مندرجہ بالا جملوں میں نمایاں کیے گئے الفاظ پر غور کیجیے۔

یہ پانچوں لفظ ایسے اسم ہیں جو خود تو کسی لفظ سے نہیں بنتے البتہ ان سے کئی دوسرے الفاظ بنتے ہیں۔ قواعد کی رُو سے انھیں اسمِ مصدر کہتے ہیں۔

نوٹ: اُردو میں اسم مصدر کی پہچان یہ ہے کہ اس کے آخر میں ''نا'' آتا ہے جیسے اُوپر کی مثالوں میں پڑھنا، مرنا، جینا، سونا، جاگنا۔

یاد رکھیے بعض اسما کے آخر میں ''نا'' تو آتا ہے مگر وہ مصدر نہیں مثلاً کانا، چونا، رانا۔

اسمِ مصدر کی آسان پہچان یہ ہے کہ آخری ''نا'' ہٹا دینے سے فعل امر بن جاتا ہے۔ اس سبق سے دس الفاظ چُنیے جو اسمِ مصدر ہوں۔

☆O☆

خواجہ حسن نظامی
(1873ء - 1955ء)
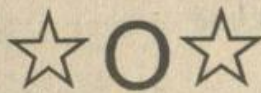
یتیم شہزادے کی ٹھوکریں

ماہِ عالم ایک شہزادے کا نام تھا جو شاہِ عالم بادشاہ دہلی کے نواسوں میں سے تھا اور غدر میں اس کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی۔ شہزادے ماہِ عالم کے باپ مرزا نوروز حیدر دیگر خاندانِ شاہی کی طرح بہادر شاہ کی سرکار سے سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے مگر ان کی والدہ کے پاس قدیم زمانے کا بہت سا اندوختہ تھا اس لیے ان کو اس روپے کی چنداں ضرورت نہیں تھی اور وہ بڑی بڑی تنخواہوں کے شہزادوں کی طرح گزر اوقات کرتے تھے۔

جب غدر پڑا تو ماہِ عالم کی والدہ بیمار تھیں۔ علاج ہو رہا تھا مگر مرض برابر ترقی کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عین اس روز جب کہ بہادر شاہ قلعے سے نکلے اور شہر کی تمام رعایا پریشان ہو کر چاروں طرف بھاگنے لگی۔ ماہِ عالم کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایسی گھبراہٹ کے موقعے پر سب کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس موت نے عجیب ہراس پیدا کر دیا۔ اس وقت نہ کفن کا سامان ممکن تھا نہ دفن کا۔ نہ غسل دینے والی عورت میسر آ سکتی تھی نہ کوئی مُردے کے پاس بیٹھنے والا تھا۔ شہزادوں میں رسم ہو گئی تھی کہ وہ مُردے کے پاس نہ جاتے، سب کام پیشہ وروں سے لیا جاتا تھا جو اس وقت کے لیے ہمیشہ موجود تیار رہتے تھے۔ غدر کی عالم گیر مصیبت کے سبب کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو تجہیز و تکفین کی خدمت انجام کو پہنچاتا۔ گھر میں دو لونڈیاں تھیں وہ بھی مُردے کو نہلانا نہ جانتی تھیں۔ خود مرزا نوروز حیدر اگرچہ پڑھے لکھے شخص تھے مگر چوں کہ ان کو ایسا کام پیش نہ آیا تھا اس لیے اسلامی طریق پر غسل و کفن سے وہ بھی واقفیت نہ رکھتے تھے۔ القصہ ان لوگوں کو اس حیرانی و پریشانی میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ اتنے میں سنا کہ انگریزی لشکر شہر میں گھس آیا ہے اور اب عنقریب قلعے میں آیا چاہتا ہے۔ اس خبر سے مرزا کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے اور جلدی سے لاش کو چارپائی پر کپڑے اُتار کر نہلانا شروع کیا۔ بس پانی کے لوٹے بھر بھر کر اوپر ڈال دیے۔ کفن کہاں سے ملتا؟ شہر تو بند

تھا۔ پلنگ پر بچھانے کی اُجلی چادریں لیں اوران میں لاش کو لپیٹ دیا۔اب یہ فکر ہوئی کہ دفن کہاں کریں۔ باہر لے جانے کا موقع نہیں۔اسی سوچ میں تھے کہ گوروں اور سکھوں کی فوج کے چند سپاہی گھر میں آگئے اورآتے ہی مرزا اوران کے لڑکے ماہِ عالم کوگرفتار کرلیا۔اس کے بعد گھر کا سامان لُوٹنے لگے۔صندوق توڑ ڈالے' الماریوں کے کواڑ اکھیڑ دیے۔کتابوں کو آگ لگادی۔

دونوں لونڈیاں غسل خانوں میں جاچھپی تھیں۔ایک سپاہی کی ان پر نگاہ پڑ گئی جس نے دیکھتے ہی اندر گھُس کر سر کے بال پکڑے اور بچاریوں کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ اگرچہ ان فوجیوں کو لاش کا حال معلوم ہو گیا تھا مگر اُنھوں نے اس کی مطلق پروانہ کی اور برابر لُوٹ مار کرتے رہے۔آخر قیمتی سامان کی گٹھڑیاں،لونڈیوں اور خود مرزا نوروز حیدراوران کے لڑکے ماہِ عالم کے سر پر رکھیں اور بکریوں کی طرح ان کو ہانکتے ہوئے گھر سے باہر لے چلے۔اس وقت مرزانے اپنے لٹے ہوئے گھر کو آخری حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اپنی بیوی کی بے گوروکفن لاش کو اکیلا چارپائی پر چھوڑ کر سپاہیوں کے ساتھ کُوچ کیا۔

لونڈیوں کو تو بوجھ اٹھانے اور چلنے پھرنے کی عادت تھی۔مرزا نوروز حیدر بھی قوی اور توانا تھے۔ بوجھ سر پر اٹھائے بے تکان چل رہے تھے،مگر غریب ماہِ عالم کی بُری حالت تھی۔اول تو اس کے سر پر بوجھ اس کی عمر اور بساط سے زیادہ تھا،اس کے علاوہ یہ شہزادہ قدرتی طور پر نہایت نازک اور کمزور واقع ہوا تھا۔اس پر سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ ماں کے مرنے کا غم تھا۔رات سے روتے روتے آنکھیں سُوج گئی تھیں۔خالی ہاتھ چلنے سے چکر آتے تھے،کجا یہ نوبت کہ سر پر بوجھ، پیچھے چمکتی ہوئی تلواریں اور جلدی چلنے کی قہرناک تاکید' بچارے کے پاؤں لڑکھڑاتے تھے۔دم چڑھ گیا تھا۔بدن پسینا پسینا ہو گیا تھا۔آخر نہایت مجبوری کی حالت میں باپ سے کہا ''ابا حضرت،مجھ سے تو چلا نہیں جاتا۔گردن بوجھ کے مارے ٹوٹی جاتی ہے۔آنکھوں کے سامنے اندھیرا آرہا ہے ایسا نہ ہو گر پڑوں۔'' باپ سے اپنے لاڈلے اکلوتے بچے کی یہ مصیبت بھری باتیں سنی نہ گئیں اوراس نے مڑ کر سپاہی سے کہا ''صاحب!اس بچے کا اسباب بھی مجھ کو دے دو۔یہ بیمار ہے گر پڑے گا۔'' گورا مرزا کی زبان بالکل نہ سمجھا اوراس طرح ٹھہرنے اور بات کرنے کو گستاخی اور بدنیتی سمجھ کر دو تین مُکے

کمر میں مارے اور آگے دھکا دے دیا۔ مظلوم مرزا نے مار بھی کھائی مگر مامتا کے مارے لڑکے کا بوجھ بغل میں لے لیا۔ گورے کو یہ حرکت بھی پسند نہ آئی اور اس نے جبراً مرزا سے گٹھڑی لے کر ماہِ عالم کے سر پر رکھ دی اور ایک گھونسا اس بے کس و ناتواں کے بھی مارا۔ گھونسا کھا کر ماہِ عالم آہ کہہ کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

مرزا نوروز اپنے لختِ جگر کی حالت دیکھ کر جوش میں آگئے اور اسباب پھینک کر ایک مُکّا گورے کے کلّے پر رسید کیا۔ اور پھر فوراً ہی دوسرا گھونسا اس کی ناک پر مارا جس سے گورے کی ناک کا بانسا پھٹ گیا اور خون کا فوارہ چلنے لگا۔ سکھ سپاہی دوسری طرف چلے گئے تھے۔ اس وقت فقط دو گورے ان قیدیوں کے ساتھ تھے۔ اور کیمپ کو لیے جا رہے تھے۔ دوسرے گورے نے اپنے ساتھی کی حالت دیکھ کر مرزا کے ایک سنگین ماری، مگر خدا کی قدرت سنگین کا وار اوچھا پڑا اور وہ مرزا کی کمر کے پاس سے کھال چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ تیموری شہزادے نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور لپک کر ایک مُکّا اس گورے کی ناک پر بھی مارا۔ یہ مُکّا بھی ایسا کاری پڑا کہ ناک بھی پچک گئی اور خون بہنے لگا۔ گورے یہ حالت دیکھ کر پستول اور کرچ تو بھول گئے اور ایک بارگی دونوں کے دونوں مرزا کو چمٹ گئے اور گھونسوں سے مارنے لگے۔ لونڈیوں نے جو یہ حالت دیکھی تو اسباب پھینک، رستے کی خاک مٹھیوں میں بھر کر گوروں کی آنکھ میں جھونک دی۔ اس ناگہانی آفت سے گورے تھوڑی دیر کے لیے بے کار ہو گئے۔ اور ان کی کرچ مرزا کے ہاتھ آگئی۔ مرزا نے فوراً کرچ گھسیٹ لی اور ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ کرچ نے شانے سے سینے تک کاٹ ڈالا۔ اس کے بعد دوسرے گورے پر حملہ کیا اور اسے بھی ذبح کر دیا۔ ان دونوں کو ہلاک کر کے ماہِ عالم کی طرف متوجہ ہوئے، وہ بالکل بے ہوش تھا۔ باپ کے گود میں لیتے ہی آنکھیں کھول دیں اور بانہیں گلے میں ڈال کر رونے لگا۔ مرزا اسی حالت میں تھے کہ پیچھے سے دس بارہ گورے اور سکھ سپاہی آگئے اور انھوں نے اپنے دو ساتھیوں کو خون میں نہایا دیکھ کر مرزا کو گھیر لیا اور لڑکے سے جدا کر کے حال پوچھا۔ مرزا نے سارا واقعہ سچ سچ کہہ دیا۔ سُنتے ہی گوروں کی حالت غصے سے غیر ہو گئی۔ انھوں نے پستول کے چھے فائر یک دم کر دیے جن سے زخمی ہو کر مرزا گر پڑے اور آناً فاناً میں تڑپ کر مر گئے۔ مرزا نوروز کی لاش کو وہیں چھوڑ دیا گیا اور ماہِ عالم کو لونڈیوں

سمیت پہاڑی کے کیمپ میں لے گئے۔

جب دہلی کی فتح سے اطمینان ہو گیا تو لونڈیاں دو پنجابی افسروں کو دے دی گئیں اور ماہِ عالم ایک انگریز افسر کی خدمت گاری پر مامور ہوئے۔ جب تک یہ انگریز دہلی میں رہے ماہِ عالم کو زیادہ تکلیف نہ تھی کیوں کہ صاحب کے پاس کئی خانساماں اور نوکر چاکر تھے' اس واسطے زیادہ کام کاج نہ کرنا پڑتا تھا لیکن چند روز کے بعد یہ صاحب رخصت لے کر ولایت چلے گئے اور ماہِ عالم کو ایک دوسرے افسر کے حوالے کر گئے جو میرٹھ چھاؤنی میں تھے۔ ان افسر کا مزاج سخت تھا۔ بات بات پر ٹھوکریں مارتا تھا۔ ماہِ عالم اس مار دھاڑ کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن بھاگنے کا ارادہ کیا۔ چناں چہ پچھلی رات کو گھر سے نکلے۔ پہرے دار نے ٹوکا تو کہہ دیا فلاں صاحب کا نوکر ہوں اور ان کے کام کو فلاں گاؤں میں جاتا ہوں تاکہ سویرے ہی پہنچ جاؤں۔ اس حیلے سے جان بچائی اور جنگل کا راستا لیا۔

چھوٹی عمر' راستے سے بے خبر' پکڑے جانے کا خوف، عجب پریشانی کا عالم تھا۔ آخر بہ ہزار دِقّت صبح ہوتے ہوتے میرٹھ سے تین چار کوس کے فاصلے پر پہنچ گئے۔ سامنے گاؤں تھا۔ وہاں جا کر ایک مسجد میں ٹھہر گئے۔ ملا صاحب نے سوالات کیے تُو کون ہے، کہاں سے آیا ہے، کہاں جائے گا۔ ماہِ عالم نے ان کو باتوں ہی باتوں میں ٹالا۔ یہاں ایک فقیر بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے جو ماہِ عالم کی شریفانہ صورت دیکھی تو محبت سے پاس بلایا اور رات کی بچی ہوئی روٹی سامنے رکھی۔ ماہِ عالم نے شاہ صاحب کو ہمدرد پا کر اپنی مصیبت کی داستان اول سے آخر تک کہہ سنائی۔ شاہ صاحب یہ کیفیت سن کر رونے لگے اور ماہِ عالم کو سینے سے لگا کر پیار کیا اور تسلی کی باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد کہا ''اب تم فکر نہ کرو میرے ساتھ رہو۔ خدا حافظ و ناصر ہے۔''

چناں چہ انھوں نے ایک رنگین کُرتا ان کو پہنا دیا اور ساتھ لے کر چل کھڑے ہوئے۔ دو چار روز تو یہ حالت رہی کہ جہاں ماہِ عالم نے کہا۔ ''حضرت' اب تو میں تھک گیا'' تو کسی گاؤں میں ٹھہر جاتے لیکن پھر ان کو بھی چلنے کی عادت ہو گئی اور پوری منزل چلنے لگے۔ مہینے بھر میں اجمیر شریف پہنچے یہاں ان صاحب کے پیر، جو بغداد کے رہنے والے تھے، ملے۔ ان پیر صاحب کو جب ماہِ عالم کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی مہربانی سے پیش آئے اور

ان دونوں کو ساتھ لے کر بمبئی چلے گئے۔ بمبئی کے قریب باندرہ میں شاہ صاحب رہتے تھے وہیں ان کو بھی رکھا اور کئی برس یہاں رہ کر ماہِ عالم نے قرآن شریف اور مسئلہ مسائل کی کتابیں پڑھیں اور نماز روزے سے خوب واقف ہو گئے۔ تب شاہ صاحب نے ان کی وہیں کسی نیک بخت سے شادی کر دی اور اُنھوں نے اسی جگہ رہنا اختیار کر لیا۔

(بیگمات کے آنسو)

سوالات

1۔ سبق کے متن کو مدِ نظر رکھ کر درست جواب پر "(✓)" کا نشان لگائیں تاکہ جملہ مکمل ہو جائے۔

i۔ ماہ عالم، بادشاہ دہلی کے.........میں تھا۔

(الف) نواسوں (ب) پوتوں (ج) بھانجوں

ii۔ غدر میں ماہِ عالم کی عمر.........سال تھی۔

(الف) گیارہ (ب) بارہ (ج) تیرہ

iii۔ مرزا نوروز حیدر.........روپے تنخواہ پاتے تھے۔

(الف) سو (ب) دو سو (ج) تین سو

iv۔ غدر میں ماہِ عالم کی.........بیمار تھیں۔

(الف) دادی (ب) نانی (ج) والدہ

v۔ کفن کہاں سے ملتا شہر تو.........تھا۔

(الف) سنسان (ب) بند (ج) ویران

2۔ کالم "الف" میں اسما اور حروف لکھے گئے ہیں جب کہ کالم "ب" میں قواعد کی اصطلاحات دی گئی ہیں۔ آپ کالم "ج" میں ہر اسم یا حرف کے سامنے قواعد کی درست اصطلاح لکھیے۔

کالم ''الف''	کالم ''ب''	کالم ''ج''
کا	حرفِ عطف	
قرآن شریف	اسمِ اشارہ	
اور	حرفِ اضافت	
سے	اسم مصدر	
یہ	حرفِ جار	
	اسم معرفہ	

3۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھیے۔

i۔ ماہِ عالم کون تھا؟

ii۔ ماہِ عالم کی والدہ کا کس موقعے پر انتقال ہوا؟

iii۔ گورے اور سکھ سپاہیوں نے مرزا نوروز حیدر کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

iv۔ پہرے دار کے ٹوکنے پر ماہِ عالم نے کیا جواب دیا؟

vi۔ ''یتیم شہزادے کی ٹھوکریں'' پڑھنے پر کیا عبرت حاصل ہوتی ہے؟

4۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

قدیم۔ اُجلی۔ اوّل۔ مصیبت۔ فقیر۔

5۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کی مدد سے واضح کیجیے۔

انتقال۔ فقط۔ ذبح۔ مسئلہ۔

6۔ ''مرض'' اور ''ناک'' کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے۔

7۔ درخت زمین کا زیور ہیں۔

مندرجہ بالا جملے میں نمایاں کیے گئے الفاظ پر غور کیجیے۔

یہ تینوں لفظ ایسے اسم ہیں جو نہ تو کسی لفظ سے نکلے ہیں اور نہ ان سے کوئی اور لفظ نکلتا ہے قواعد کی رو سے انھیں اسمِ جامد کہتے ہیں۔

اس سبق سے اسمِ جامد کی پانچ مثالیں تلاش کیجیے۔

شاہد احمد دہلوی
(1906ء-1967ء)

پروفیسر مرزا محمد سعید

صبح اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا کہ پروفیسر محمد سعید کا آج سوئم ہے! خاموش زندگی! خاموش موت! مرزا صاحب کی علالتِ مزاج یا مرض الموت کی اطلاع اس سے پہلے کہیں سے نہیں ملی۔ حد یہ کہ پرسوں وہ رحلت فرما گئے اور ان کے سینکڑوں دوستوں اور قدر دانوں کو اس سانحۂ ارتحال کی خبر تک نہ ہوئی۔ افسوس! اتنا بڑا صاحبِ کمال ہم میں سے اُٹھ جائے اور اس کی سناؤنی ہم تک نہ پہنچے! کتنے بے خبر ہیں ہم لوگ! زندہ قوموں کا یہ شعار نہیں ہوتا کہ اپنے اہل کمال سے غافل ہو جائیں۔ ایسی غفلت مجرمانہ ہوتی ہے۔ شاید یہ ہماری غفلت ہی کی سزا ہے کہ مرزا صاحب کو یوں ایکا ایکی ہم سے چھین لیا گیا۔

عالِم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے۔ ابھی ہم کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مرزا صاحب کے رخصت ہو جانے سے ہمارا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ اب ان کی عدم موجودگی رہ رہ کر ہمیں ان کی یاد دلائے گی اور وقت کے ساتھ ان کی جدائی کا گھاؤ بڑھتا چلا جائے گا۔ مرزا صاحب بہت ہی خاموش کام کرنے والوں میں سے تھے۔ یعنی اتنے خاموش کہ خود ان کے زمانے کے اکثر لوگ بھی ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے واقف نہیں ہوئے۔ دراصل خود مرزا صاحب شہرت سے گھبراتے تھے اور پبلک پلیٹ فارم پر آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کام کرتے تھے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر۔ کام کرتے تھے اپنی تسکین کے لیے۔ کام کرتے تھے اس لیے کہ انھیں کام کرنا ہوتا تھا۔ فرمائشی کام انھوں نے ساری عمر نہیں کیے۔ انھوں نے اب سے پچپن سال پہلے عبدالقادر کے رسالے "مخزن" میں مضامین لکھے مگر شیخ صاحب کی فرمائش پر نہیں بلکہ خود ان کا جی لکھنے کو چاہا۔ مرزا کسی کو خوش کرنے کے لیے نہیں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب پیسے کے لیے بھی نہیں لکھتے تھے۔ پیسے کی تو انھوں نے کبھی پروا ہی نہیں کی، بلکہ پیسے کے ذکر پر وہ چڑ جاتے تھے اور انھیں منانا مشکل

ہو جاتا تھا۔ لاہور کے اکثر پبلشروں نے مرزا صاحب سے کتابیں لکھوانی چاہیں اور بڑی بڑی رقمیں پیش کیں مگر مرزا صاحب نے انھیں ایک لفظ بھی لکھ کر نہیں دیا اور جب اپنا پہلا ناول ''خوابِ ہستی'' لکھا اسے بھی بغیر کچھ لیے دیے چھپوا دیا۔

ایک پبلشر صاحب لاہور سے دلی محض اس غرض سے آئے تھے کہ مرزا صاحب سے ناول لکھوائیں گے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ مرزا صاحب نہیں لکھیں گے۔ مگر وہ بڑے بڑے مُصنفوں کو خرید چکے تھے، نہ مانے۔ بولے " ہم انھیں ایک ناول کا ایک ہزار روپیہ دیں گے تو وہ کیوں نہیں لکھیں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دو ڈھائی سو روپے میں اچھا خاصا ناول پبلشر کو مل جاتا تھا۔ چناں چہ مجھے اپنے ساتھ لے کر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مَیں نے تعارف کرایا۔ مرزا صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔ پبلشر صاحب نے چھوٹتے ہی ناول لکھنے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ بولے " آپ میرے ناول کے پانچ ہزار دے دیں گے، دس ہزار دے دیں گے۔ مجھے یہ منظور نہیں ہے کہ جو کام کر رہا ہوں اُسے چھوڑ کر آپ کے لیے ناول لکھوں "۔ پانچ دس ہزار کی بات سن کر پبلشر صاحب کی سٹی گم ہوگئی اور دو چار منٹ پہلو بدل کر رخصت چاہی۔

مرزا صاحب اس زمانے میں اپنی معرکتہ الآرا کتاب "مذہب اور باطنیت" لکھ رہے تھے جسے مکمل ہونے کے بعد ان کے دوست پروفیسر تاجور نجیب آبادی ان سے لے گئے اور لاہور سے وہ کتاب شائع ہوئی۔ مرزا صاحب کا یہی صرف ایک کارنامہ ہے مگر ایسا کارنامہ کہ اردو کی اگر سو عمدہ کتابیں چھانٹی جائیں تو ان میں " مذہب اور باطنیت " کو ضرور شامل کرنا پڑے گا۔

مرزا صاحب دلی کے شرفا کے ایک متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تراہا بیرم خان سے آگے بڑھ کر ایک راستا سیدھے ہاتھ کو مڑ جاتا ہے، اسی کے نکڑ پر مرزا صاحب کا آبائی مکان تھا۔ اسی علاقے میں سر سید احمد خاں کا قدیم مکان بھی تھا۔ سر سید سے بھی مرزا صاحب کی عزیز داری تھی اور منشی ذکاء اللہ سے بھی ان کی قرابت داری ہوگئی تھی۔ پچاس ساٹھ سال پہلے دلی کے مسلمان شرفا میں انگریزی تعلیم کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا مگر سر سید نے مسلمانوں کے اس غلط نظریے کی بہت کچھ اصلاح کر دی تھی۔ اسی زمانے میں دلی کے دو

نوجوانوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے علمی حلقوں میں نمود حاصل کی۔ ایک پروفیسر مشتاق احمد زاہدی تھے اور دوسرے پروفیسر مرزا محمد سعید۔

مرزا صاحب نے اس صدی کے آغاز میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے استادوں میں علامہ اقبال بھی تھے۔ جن سے ان کے مخلصانہ تعلقات آخر تک قائم رہے۔ انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کی سَنَد لینے کے بعد مرزا صاحب نے 7-1906ء میں سال دو سال علی گڑھ میں پڑھایا اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور ہی میں انگریزی کے پروفیسر ہو گئے۔ پنجاب کے بیشتر اعلیٰ عہدہ دار مرزا صاحب کی علمیت کے معترف تھے۔ پطرس اور تاج نے بھی مرزا صاحب سے اکتسابِ علم کیا۔ بعد میں پطرس خود انگریزی کے پروفیسر ہو گئے تھے مگر اپنی غیر معمولی قابلیت و ذہانت کے باوجود مرزا صاحب کی علمیت کے آگے اپنے آپ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مَیں نے بارہا پطرس کو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے دیکھا ہے۔ پطرس کو میں نے کسی اور کا اتنا ادب واحترام کرتے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ وائسرائے ہند کا بھی۔

جنگ کے زمانے میں حُسنِ اتفاق سے دِلّی میں لاہور کے بیشتر ادیب اور شاعر ریڈیو میں یا دوسرے سرکاری محکموں میں جمع ہو گئے تھے۔ پطرس کی تحریک پر ایک محدود ادبی حلقہ قائم کیا گیا۔ جس میں ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض، حامد علی خاں، چراغ حسن حسرت، محمود نظامی، غلام عباس، انصار ناصری وغیرہ شریک کیے گئے تھے۔ ہر مہینے اس کا ایک جلسہ ہوتا تھا، کبھی پطرس کے گھر پر اور کبھی ڈاکٹر تاثیر کے گھر پر۔ اس میں ایک مقالہ کسی ادبی موضوع پر پڑھا جاتا تھا اور اس پر گفتگو ہوتی۔ ایک جلسے میں محمود نظامی نے ایک مقالہ پڑھا۔ اس میں مرزا صاحب سے درخواست کی گئی کہ کچھ فرمائیں۔ مرزا صاحب بحث مباحثے کو ناپسند کرتے تھے اس لیے بڑی محتاط رائے دیتے تھے۔ انداز کچھ ایسا ہوتا تھا "نہیں یہ بات تو نہیں۔ مگر خیر ایسا بھی ہوتا ہے"۔ پطرس کو شوخی سُوجھی۔ فیض کو اشارہ کیا۔ وہ مرزا صاحب سے زیادہ واقف نہیں تھے، بات کاٹ کو فوراً شروع ہو گئے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ رومی تہذیب یونانی تہذیب کے بعد اُبھری۔ اُن کا اتنا کہنا اور مرزا صاحب کا جلال میں

آ جانا۔ جی ہاں، یہ جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ.......... پرانی تہذیبوں کی تاریخ کا ایک دریا تھا اُمڈا چلا آتا تھا۔ اس دن مجھے بھی اندازہ ہوا کہ مرزا صاحب کے سینے میں علم کی کتنی دولت بھری پڑی ہے۔ فیض پشیمانی سے بار بار مرزا صاحب کی طرف دیکھتے تھے۔ پطرس دل ہی دل میں ہنس رہے تھے کہ دیکھا اسے کہتے ہیں علم کا سمندر۔ ہم سب دم بخود ساکت بیٹھے مرزا صاحب کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ پطرس نے مرزا صاحب کا جلال ختم کرنے کے لیے فوراً چائے کا سامان رکھوانا شروع کر دیا اور خدا خدا کر کے مرزا صاحب کا جلال رفع ہوا۔

مرزا صاحب گھنٹوں مُطالعہ کرتے تھے۔ اُن کے کتب خانے میں ہر علم کی کتاب موجود تھی۔ ملازمت درس و تدریس ہی کی تھی۔ اس لیے نئی سے نئی کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ " اگر میں اتنا مُطالعہ نہ کروں تو ان انگریز پروفیسروں کے آگے کیسے ٹھہر سکتا ہوں؟ پنشن لینے کے بعد بھی ان کا واحد مشغلہ مطالعۂ کتب ہی رہا۔ ان کا یہ شغل اب تک جاری تھا۔ پنشن کا بڑا حصہ کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتے تھے۔

مرزا صاحب کی زندگی بڑی سیدھی سادی تھی۔ کرّ و فر، ٹھاٹ باٹ سے کبھی نہیں رہے۔ گھر کی سواری ہم نے ان کے پاس کبھی نہیں دیکھی۔ معدے کے مریض تھے۔ پیدل زیادہ چلتے تھے۔ صبح ٹہلنے ضرور جاتے تھے۔ رات کو جلدی سو جاتے تھے۔ کھیل تماشے، سینما، تھیٹر کچھ زیادہ نہیں دیکھتے تھے۔ خدا کے فضل سے گھر کا آرام انھیں مُیسّر تھا۔ اُن کی بیگم بھی ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ دو ایک ناول اُن کے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اولاد سعادت مند، بیوی سلیقہ شعار پنشن اتنی کہ بڑھاپے میں کسی کی محتاجی نہیں، کھانا سادہ، لباس سادہ، رہن سہن سادہ پھر احتیاج ہو تو کس بات کی؟ قلب مطمئنہ کی دولت سے مالا مال تھے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے جب مسلم لیگ نے زور پکڑا تو مرزا صاحب نے سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور مسلم لیگ کونسل کے ممبر چنے گئے۔ کراچی یونی ورسٹی قائم ہوئی تو اس کے مشیر مقرر ہوئے، اور جب پاکستانی ادیبوں کا گلڈ 1959ء میں بنایا گیا تو مرزا صاحب ہی نے اس کے پہلے اجلاس کی صدارت

فرمائی۔

مرزا صاحب بظاہر علیل نہیں معلوم ہوتے تھے، اکہرا ڈیل، اُجلا رنگ، کشادہ پیشانی، گھنی بھوؤں کے سائے میں بڑی بڑی روشن آنکھیں، رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی، کتروواں مونچھیں، ہنستے تو سامنے کے دو چار دانت ٹوٹے ہوئے نظر آتے مگر بُرے نہیں لگتے تھے۔ ڈاڑھی مُنڈی ہوئی۔ دھان پان سے آدمی تھے۔ 30ء میں جب مَیں نے انھیں پہلی دفعہ دیکھا تو ان کی عمر چوالیس، پنتالیس سال کی تھی۔ 62ء میں جب وہ 76 سال کے تھے تب بھی وہ ویسے کے ویسے ہی تھے۔ انھیں زمانے کا شکوہ یا صحت کی شکایت کرتے کبھی نہیں سنا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ سنا ہے کہ دِلّی کے جن دو چار نوجوانوں نے سب سے پہلے سُوٹ پہننا شروع کیا ان میں سب سے نفیس سُوٹ مرزا صاحب ہی کا ہوتا تھا مگر مَیں نے پچھلے 32 سال میں انھیں ہمیشہ شیروانی ہی پہنے دیکھا۔ اُن کی گفتگو میں انگریزی کے الفاظ بالکل نہیں آنے پاتے تھے۔ چالیس سال کی عمر کے بعد ہی ان کے دونوں ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا، اس لیے لکھنے میں انھیں زحمت ہوتی تھی۔ خوش اخلاق اور خوش مزاج تھے مگر زیادہ دوست بنانے کے قائل نہیں تھے۔ آپ بھلے اور اپنا گھر بھلا۔

موت برحق ہے۔ مرنا سب کو ہے۔ مگر مرنے مرنے میں فرق ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے خاصی عمر پائی مگر ان کی وفات کا صدمہ اس لیے زیادہ ہے کہ ایسے قابل، ایسے شریف اور ایسے وضع دار لوگ زمانہ اب پیدا نہیں کرے گا۔ افسوس کہ پروفیسر مرزا محمد سعید اب وہاں ہیں جہاں ہماری نیک آرزوئیں رہتی ہیں۔ ایسی جامع العلوم ہستی سے محروم ہونے کا ہمیں جتنا بھی غم ہو کم ہے۔

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے!

سوالات

1۔ سبق کا متن مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں

i- "یاسمین" مرزا محمد سعید کا ناول ہے۔

(الف) پہلا (ب) دوسرا (ج) تیسرا

ii -i- مرزا محمد سعید مطالعہ کرتے تھے۔

(الف) معلومات کے حصول کے لیے

(ب) دُوسروں پر رعب ڈالنے کے لیے

(ج) انگریز پروفیسروں پر سبقت لے جانے کے لیے

i- ii- iii- مرزا محمد سعید مسلم لیگ کے کس عہدے پر فائز رہے؟

(الف) صوبائی صدر

(ب) صوبائی نائب صدر

(ج) صوبائی سیکرٹری

2۔ سبق کا متن مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیے۔

i- مرزا محمد سعید کے معروف ترین ناول کا نام لکھیں۔

ii- اس سبق میں مرزا محمد سعید کی جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے، اُن کے نام لکھیں۔

iii- پطرس کی تحریک پر بننے والے محدود ادبی حلقے میں فیض احمد فیض کیوں کر پشیمان ہوئے؟

iv- مرزا محمّد سعید کس بات کے ذکر پر چڑ جاتے تھے؟

3۔ اس سبق کا خلاصہ لکھیں۔

4۔ مندرجہ ذیل نثر پاروں کی تشریح کیجیے۔

(الف) ''عالمِ کی موت .... ساری عمر نہیں کیے۔''

(ب) ''مرزا صاحب دِلّی کے متمول .... پروفیسر مرزا محمد سعید۔''

5۔ (i) دریا میں مچھلیاں ہیں۔

(ii) بازار سے سموسے لاؤ۔

(iii) بھائی جان کالج تک گئے ہیں۔

(iv) اجمل چھت پر کھڑا ہے۔

مندرجہ بالا جملوں میں نمایاں کیے گئے کلمات ایک اسم کو دوسرے اسم یا فعل سے ملا رہے ہیں انھیں حروفِ جار کہتے ہیں۔ چند مشہور حروفِ جار یہ ہیں:۔

میں ، سے ، پَر ، تک ، کو ، بیچ ، درمیان ، ساتھ ، نیچے۔

آپ اس سبق میں سے پانچ ایسے جملے تلاش کیجیے جن میں حروفِ جار استعمال ہوئے ہوں۔

☆O☆

منشی پریم چند
(1880ء - 1936ء)

بڑے بھائی صاحب

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے لیکن صرف تین درجے آگے۔ انھوں نے بھی اِسی عمر میں پڑھنا شروع کیا، جب مَیں نے شروع کیا، لیکن تعلیم جیسے اہم معاملے میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے۔ اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے۔ سال کا کام دو سال میں کرتے تھے تاکہ عمارت پختہ ہو جائے۔ میں چھوٹا تھا، وہ بڑے تھے۔ میری عمر نو سال تھی وہ چودہ سال کے تھے۔ انھیں میری تنبیہ اور نگرانی کا پُورا اور پیدائشی حق تھا اور میری سعادت مندی اسی میں تھی کہ ان کے حکم کو قانون سمجھوں۔

وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے۔ ہر وقت کتاب کھولے رہتے اور شاید دماغ کو آرام دینے کے لیے کبھی کاپی پر، کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں، کتابوں، بلیوں کی تصویریں بنایا کرتے۔ کبھی کبھی ایک ہی نام کو دس بیس بار لکھ جاتے، کبھی ایک شعر کو دس بیس بار خوش خط حروف میں نقل کرتے، کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط ہوتا نہ کوئی معنی مثلاً ایک بار ان کی کاپی میں مَیں نے یہ عبارت دیکھی، اسپشل آئینہ بھائیو بھائیوں دراصل، بھائی بھائی رادھے شیام شری جت رادھے شیام، ایک گھنٹے تک۔ اس کے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی اس عبارت میں کوئی معنی نکالوں لیکن ناکام رہا اور ان سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ نویں جماعت میں تھے مَیں پانچویں جماعت میں، ان کی تحریر سمجھنا میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات تھی۔

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا۔ ایک گھنٹا بھی کتاب لے کر بیٹھنا بارِ خاطر تھا۔ موقع پاتے ہی ہوسٹل سے نکل کر میدان میں آجاتا اور کبھی کنکریاں اچھالتا، کبھی کاغذ کی پتلیاں اُڑاتا اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا۔ کبھی چار دیواری پر چڑھ کر پیچھے کُود رہے ہیں۔ کبھی پھاٹک پر سوار ہو کر موٹر کا لطف اٹھا رہے ہیں لیکن کمرے میں آتے ہی بھائی

صاحب کی صورت دیکھ کر روح فنا ہو جاتی اور سارا مزا کر کرا ہو جاتا۔ پہلا سوال ہوتا کہاں تھے؟ اس کا جواب خاموشی کے سوا میرے پاس کچھ نہ ہوتا۔ نہ جانے میری زبان سے یہ بات کیوں نہ نکلتی، ذرا باہر کھیل رہا تھا۔ میری خاموشی اعترافِ گناہ سمجھی جاتی اور بھائی صاحب بزرگانہ محبت اور تندی سے ملے ہوئے لہجے میں کہتے اس طرح انگریزی پڑھو گے تو زندگی بھر پڑھتے رہو گے اور ایک حرف نہ آئے گا۔ انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ جو چاہے پڑھ لے۔ اس طرح انگریزی آتی تو سبھی پڑھ لیتے۔ یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں، خون جلانا پڑتا ہے تب کہیں جا کر انگریزی آتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ تم کتنے کوڑھ مغز ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتے۔ میں کتنی محنت کرتا ہوں یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمھارا قصور ہے، تمھاری عقل کا قصور ہے، اتنے میلے تماشے ہوتے ہیں میں کبھی نہیں جاتا۔ روز کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوتے ہیں مَیں قریب نہیں پھٹکتا۔ ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں۔ اس پر دو دو تین تین سال ایک ایک درجے میں پڑا رہتا ہوں۔ پھر تم کیسے امید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت گنوا کر پاس ہو جاؤ گے۔ مجھے دو تین ہی سال لگتے ہیں۔ تم ساری زندگی اسی درجے میں پڑے سڑتے رہو گے۔ اگر تمھیں اسی طرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلّی ڈنڈا کھیلو۔ دادا کی گاڑھی کمائی کے روپے کیوں برباد کرتے ہو۔

میں یہ پھٹکار سن کر آنسو بہانے لگتا۔ جواب ہی کیا تھا۔ بھائی صاحب کو نصیحت کے فن میں کمال تھا۔ ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت ٹوٹ جاتی۔ اسی طرح جان توڑ کر محنت کرنے کی طاقت مَیں اپنے میں نہ پاتا تھا اور ذرا دیر کے لیے مجھ پر مایوسی چھا جاتی اور میں سوچتا کیوں نہ گھر چلا جاؤں۔ جو کام میرے برتے سے باہر ہے اس میں ہاتھ ڈال کر کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرتا۔ ٹائم ٹیبل بناتا صبح اٹھتا، منہ دھو کر ناشتہ کرتا، پھر انگریزی مطالعہ سات سے آٹھ تک، حساب آٹھ سے نو تک، تاریخ نو سے ساڑھے نو تک کرتا۔ کھانا کھا کر اسکول جاتا۔ ساڑھے تین بجے اسکول سے واپس۔ آدھ گھنٹے تک آرام۔ پانچ تک جغرافیہ

اور نقشا۔ پانچ سے چھے تک گرامر۔ آدھ گھنٹا آرام۔ چھے سے ساڑھے سات تک انگریزی
کمپوزیشن۔ پھر کھانا کھا کر آٹھ سے نو تک انگریزی، نو سے دس تک اردو، دس سے گیارہ تک
متفرق مضامین، مگر ٹائم ٹیبل بنالینا ایک بات تھی اس پر عمل کرنا دوسری بات۔ پہلے ہی دن
سے اس کی خلاف ورزی شروع ہو جاتی۔ میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا، وہ دلآویز ہریالی، وہ
پُر لطف آزادی مجھے اضطراری طور پر کھینچ لے جاتی اور بھائی صاحب کو نصیحت اور فضیحت
کرنے کا موقع مل جاتا۔ میں ان کے سائے سے بھاگتا، ان کی نگاہوں سے دُور رہنے کی
کوشش کرتا۔ کمرے میں اس طرح دبے پاؤں آتا کہ انھیں خبر نہ ہو۔ اُن کی نظر میری جانب
اٹھی اور میری روح فنا ہوئی۔ ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیر سی لٹکتی معلوم ہوتی۔ کتابوں سے
نفرت سی ہوتی جاتی تھی۔

(2)

سالانہ امتحان ہوا، بھائی صاحب فیل ہو گئے۔ میں پاس ہو گیا اور درجہ اوّل میں
آیا۔ میرے اور ان کے درمیان صرف دو درجوں کا تفاوت رہ گیا۔ جی میں آیا، بھائی کو
آڑے ہاتھوں لُوں۔ آپ کی وہ شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی۔ مجھے دیکھیے مزے سے
کھیلتا رہا اور درجہ اول میں ہوں۔ لیکن وہ اس قدر پژمردہ اور شکستہ خاطر تھے کہ مجھے ان سے
دلی ہمدردی ہوئی اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی شرمناک معلوم ہوا۔ ہاں اب
مجھے اپنے اوپر کچھ اعتماد پیدا ہوا اور بھائی صاحب کا وہ رعب مجھ پر نہ رہا۔ آزادی سے
کھیل کُود میں شریک ہونے لگا۔ دل مضبوط تھا۔ اگر انھوں نے پھر فضیحت کی تو صاف کہہ
دوں گا آپ نے اپنا خون جلا کر کون سا تیر مار لیا۔ میں تو کھیلتے کُودتے درجہ اول میں آگیا۔
زبان سے ہیکڑی جتانے کی ہمت نہ ہونے پر بھی میرے بُشرے اور انداز سے صاف ظاہر
ہوتا تھا کہ بھائی صاحب سے اتنا مرعوب نہیں ہوں۔

بھائی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور ایک روز جب میں صبح کا سارا وقت
گلی ڈنڈے کی نذر کر کے ٹھیک کھانے کے وقت آیا تو بھائی صاحب نے گویا میان سے تلوار

کھینچ لی اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ " دیکھتا ہوں، امسال پاس ہو گئے اور درجہ اول میں آ گئے تو اب تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مگر بھائی صاحب گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا۔ تمھاری کیا ہستی ہے۔ انسان اور چاہے جو بُرائی کرے، غرور کیا اور دین و دنیا سے گیا۔ ابلیس کا حال پڑھا ہوگا۔ اسے غرور ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنت سے دوزخ میں دھکیل دیا گیا۔ شاہِ روم نے بھی ایک بار غرور کیا تھا، بھیک مانگ مانگ کر مر گیا۔ تم نے ابھی صرف ایک درجہ پاس کیا ہے اور ابھی سے تمھارا سر پھر گیا۔ تب تم آگے پڑھ چکے۔ یہ سمجھ لو کہ تم اپنی محنت سے نہیں پاس ہوئے اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہے، مگر بٹیر صرف ایک بار ہاتھ لگ سکتی ہے، بار بار نہیں لگ سکتی۔ کبھی گلّی ڈنڈے میں بھی اندھی چوٹ نشانے پر پڑ جاتی ہے، اس سے کوئی کامیاب کھلاڑی نہیں ہو جاتا۔ کامیاب کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ جائے۔ میرے فیل ہونے پر مت جاؤ، میرے درجے میں آؤ گے تو دانتوں پسینا آ جائے گا۔ میرے درجے میں آؤ گے تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ اس درجے میں اول آ گئے ہو تو اتنا اِتراتے ہو، میرا کہنا مانیے۔ لاکھ فیل ہو گیا۔ لیکن تم سے بڑا ہوں، دنیا کا تم سے زیادہ تجربہ حاصل کیا ہے، میرا کہنا مانو، جو کچھ کہتا ہوں اسے گرہ سے باندھو ورنہ پچھتاؤ گے۔

اسکول کا وقت قریب تھا ورنہ خدا جانے یہ نصیحت کب ختم ہوتی۔ مجھے آج کا کھانا بالکل بے مزا معلوم ہوا۔ جب پاس ہونے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے تو کہیں فیل ہو جاؤں تو یہ حضرت زندہ ہی نہ چھوڑیں گے۔ انھوں نے اپنے درجے کی پڑھائی کی جو ہیبت ناک تصویر کھینچی تھی، اس نے مجھے سچ مچ لرزا دیا۔ کیسے اسکول چھوڑ کر گھر نہیں بھاگا یہی تعجب ہے۔ لیکن یہ سب دُرگت ہونے پر بھی کتابوں سے میری بیزاری بدستور برقرار رہی۔ کھیل کود کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ پڑھتا بھی تھا مگر بہت کم، بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے اور درجے میں ذلیل نہ ہونا پڑے، اپنے اوپر جو اعتماد پیدا ہوا تھا وہ پھر فنا ہو گیا اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی۔

(3)

پھر سالانہ امتحان ہوا اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور بے چارے بھائی صاحب پھر فیل ہو گئے۔ میں نے زیادہ محنت نہیں کی، مگر خدا جانے کیسے درجہ اول آ گیا، مجھے خود تعجب ہوا۔ بھائی صاحب نے حیرت انگیز محنت کی تھی۔ دس بجے رات تک، ادھر چار بجے صبح سے، پھر ادھر چھ سے ساڑھے نو تک اسکول جانے سے قبل، چہرہ زرد ہو گیا تھا مگر فیل۔ مجھے ان پر رحم آتا تھا۔ نتیجہ سنایا گیا تو رو پڑے اور میں بھی رونے لگا۔

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان صرف ایک درجے کا تفاوت باقی رہ گیا تھا۔ میرے دل میں ایک بیہودہ خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہو جائیں تو ان کے برابر ہو جاؤں۔ پھر کس بنا پر میری فضیحت کر سکیں گے۔ لیکن میں نے اس خیال کو دل سے فوراً نکال دیا۔ آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری ہی بھلائی کے لیے۔ مجھے اس وقت ناگوار لگتا ہے ضرور مگر شاید ان کی تنبیہ کا ہی اثر ہو کہ میں یوں دنادن پاس ہوتا جاؤں اور اتنے اچھے نمبروں سے۔

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے۔ کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پا کر بھی انھوں نے تحمل سے کام لیا۔ شاید اب انھیں محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مجاز اب انھیں نہیں رہا، یا رہا تو بہت کم۔

ایک روز شام کے وقت ہاسٹل سے دور میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا کہ بھائی صاحب سے میری مڈ بھیڑ ہو گئی۔ شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے۔ انھوں نے وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے حقارت کی نظروں سے دیکھ کر بولے "ان بازاری لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لیے دوڑتے تمھیں شرم نہیں آتی۔ تمھیں اس کا بھی کچھ لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو، بلکہ آٹھویں جماعت میں آ گئے ہو، اور مجھ سے صرف ایک درجہ پیچھے ہو۔ آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ آٹھواں درجہ پاس کر کے نائب تحصیل دار ہو جاتے تھے۔ میں کتنے ہی مڈلچیوں کو جانتا ہوں جو آج اوّل درجے کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ کتنے ہی ہمارے لیڈر ہیں، بی۔ اے اور ایم اے والے ان

کے ماتحت اوران کے پیرو ہیں اورتم اسی آٹھویں درجہ میں آکر بازاری لونڈوں کے ساتھ کنکوے کے لیے دوڑ رہے ہو۔ افسوس ہے تمھاری اس ناعقلی پر، تم ذہین ہو اس میں شک نہیں، لیکن وہ ذُہن کس کام کی جس سے آدمی اپنا وقار کھو بیٹھے۔ تم اپنے دل میں یہ سمجھتے ہو میں ان سے محض ایک درجہ پیچھے ہوں اور اب انھیں مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے میں تمھارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کرسکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور چاہے آج تم میری جماعت میں آجاؤ اور ممتحنوں کا یہی حال ہے تو یقیناً اگلے سال میرے ہم جماعت ہو جاؤ گے اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ۔

میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوئے اپنی ناسعادت مندی پر نادم ہوکر بچشمِ نم کہا۔ "ہرگز نہیں، آپ جو کچھ فرما رہے ہیں، وہ معقول ہے اور آپ کو اس کے کہنے کا حق ہے"۔

بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظروں سے دیکھا اور مجھے گلے لگا لیا ور بولے میں کنکوے اڑانے سے منع نہیں کرتا۔ میرا جی بھی کبھی کنکوے اڑانے کو للچاتا ہے، کروں کیا خود بے راہ چلوں تو تمھیں ہدایت کیسے کروں، یہ فرض تو میرے سر پر ہے۔

اتفاق سے اسی وقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گزرا، اس کی ڈور لٹک رہی تھی۔ بھائی صاحب لمبے تھے۔ اچھل کر اس کی ڈور پکڑ لی اور اسے لیے ہوئے ہوسٹل کی طرف دوڑے۔ میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

(زادِ راہ)

سوالات

1۔ سبق کا متن مدِّ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل جُملوں کی تکمیل کے لیے درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں

i- میرے بھائی صاحب مجھ سے.............سال بڑے تھے

(الف) چار (ب) پانچ (ج) چھے

-ii انگریزی پڑھنا کوئی .... نہیں ہے۔

(الف) مذاق (ب) سہل (ج) ہنسی کھیل

-iii بڑے بھائی صاحب بڑے .... واقع تھے۔

(الف) محنتی (ب) ذہین (ج) قابل

-iv بڑے بھائی صاحب نے اپنے درجے کی پڑھائی کی .... تصویر کھینچی۔

(الف) ہیبت ناک (ب) دردناک (ج) خوف ناک

2۔ متن کو مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیے۔

الف۔ بڑے بھائی صاحب ہر سال فیل ہونے کے باوجود چھوٹے بھائی کو لعن طعن کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے، کیوں؟

ب۔ ابلیس کو کیا سزا ملی؟

3۔ اس سبق میں مندرجہ ذیل دو ضرب الامثال بیان کی گئی ہیں، آپ ان کا مطلب لکھیے۔

الف۔ چھوٹا منہ بڑی بات ب۔ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنا

4۔ مندرجہ ذیل مشابہ الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا فرق واضح ہو جائے۔

عمارت۔ امارت۔ واقعہ۔ واقع۔ نذر۔ نظر۔ اسرار۔ اصرار۔

5۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

روح فنا ہو جانا۔ ہمت ٹوٹ جانا۔ آڑے ہاتھوں لینا۔ پاپڑ بیلنا۔ زخم پر نمک چھڑکنا۔ تیر مارنا۔ گرہ سے باندھ لینا۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونا۔ ہاتھ پاؤں پھول جانا۔

6۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے۔

دوزخ۔ مجاز۔ لحاظ۔ وقار۔ تار۔ اخبار

7۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفّظ اِعراب کی مدد سے واضح کیجیے۔

سوال۔ محبت۔ تفاوت۔ امتحان۔ غرور۔ تجربہ۔ بزرگ۔ حکومت۔ پرورش۔ ہدایت۔

8۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے مترادف لکھیے۔

طاقت۔ فن۔ غرور۔ ستم۔ عزت

9۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

صبح۔ روز۔ دن۔ نفرت۔ تیز۔ ذلیل۔ اعتماد۔ فنا۔ معقول۔ آزادی۔

10۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا املا درست کیجیے۔

مضبوت۔ کمرہ۔ دوئم۔ گرائمر۔ بلکُل۔ میلہ۔ السلام وعلیکم

11۔ مدثر بہترین **کھلاڑی** ہے۔ عظیم **چلتی** بس سے گر پڑا۔

سوار محمد حسین **رینگتے رینگتے** دشمن کے علاقے میں گھس گیئے۔

پہلے جملے میں نمایاں کیا گیا لفظ ''کھلاڑی'' کھیلنا سے مشتق ہے۔ دوسرے اور تیسرے جملے میں ''چلتی'' اور ''رینگتے رینگتے'' کے الفاظ بالترتیب ''چلنا'' اور ''رینگنا'' سے نکلے ہیں اور قواعد کی رُو سے اسم مشتق کہلاتے ہیں۔

اس سبق میں سے پانچ اسم مشتق تلاش کر کے لکھیے۔

☆O☆

چراغ حسن حسرت

(1902ء-1955ء)

"سِند باد جہازی"

"لاہور کے ایک شیر فروش پر جو دودھ میں پانی ملا کر بیچتا تھا، چار سو روپے جرمانہ ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیر فروش اناڑی تھا ورنہ دودھ میں پانی ملا کے بیچنے کی بجائے پانی میں دودھ ملا کر بیچتا تو جرمانے سے بچ جاتا"

☆O☆
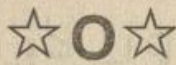
"مَثل مشہور ہے، ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' پولیس کے ہاتھوں میں تو ہمیشہ ڈنڈا رہا ہے، سیاسی لوگوں کے ہاتھ میں ووٹ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ووٹ بھی ڈنڈا بن گیا ہے یعنی یہ دونوں ڈنڈے والے ہیں اور حکومت صرف بھینس بن کے رہ گئی ہے۔ جس کا جی چاہے ڈنڈے کے زور سے اسے جدھر چاہے لے جائے۔

ہم اور آپ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ بین بجاتے رہیں یعنی کبھی یہ کہ دیں کہ اے صاحب! عوام کے حقوق کا بھی خیال کیجیے۔ دیکھیے فلاں الاٹمنٹ ناجائز ہے لیکن ہم بھینس کے آگے بین بجا رہے ہیں اور بھینس موسیقی کا ذوق نہیں رکھتی ہے۔ وہ ذرا کان کھڑے کرتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری بھیرَویں اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ کان کھڑے کر کے داد دے رہی ہے۔ حالاں کہ کان کھڑے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مکھیاں اسے تنگ کر کے الاٹمنٹ میں اپنا حصہ مانگ رہی ہیں۔

ہمارا دل گُردہ دیکھیے کہ ہم بین بجاتے بجاتے اُکتاتے نہیں۔ یہ نہیں کیا کہ بین وہیں پٹک کر سیدھے اپنے گھر چلے آئے ہوں بلکہ یہ سوچ کر بین بجائے جا رہے ہیں کہ کیا عجب ہے کہ ہماری محنت پروان چڑھے، یعنی بھینس بین سنتے سنتے پسیج جائے"۔

☆O☆
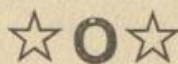
"بعض حضرات ہم سے خطوں میں ایسے ایسے سوال کرتے ہیں جن کا جواب دینا اچھا خاصا مشکل کام ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے ہمارے نام ایک لمبا چوڑا خط لکھا ہے جس

کا خلاصہ یہ ہے کہ سرکارِ دربار میں اردو کا چلن کب ہوگا؟ اور انگریزی کو کب دیس نکالا ملے گا؟

بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے اکثر بڑے بڑے لوگوں کا یہ حال ہے کہ انگریزی کے بغیر ان کا دو قدم چلنا محال ہے۔ یہ بزرگوار انگریزی بولتے، انگریزی لکھتے، انگریزی پہنتے اور انگریزی اوڑھتے ہیں، یعنی ان کا اوڑھنا بچھونا انگریزی ہے۔ ان لوگوں کو غصہ انگریزی میں آتا ہے۔ وہ گالیاں انگریزی میں دیتے ہیں بلکہ محبت بھی انگریزی ہی میں کرتے ہیں۔ اس لیے توقع بے سُود ہے کہ چند برس کے اندر اردو انگریزی کی جگہ لے لے گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے اکثر لیڈر اردو کی پُر زور حمایت کرتے ہیں، اور اپنی تقریروں میں بار بار کہتے ہیں کہ پاکستان کی زبان اردو ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ اردو کو وہی حیثیت دے دینا چاہتے ہیں جو انگریزی کو حاصل ہے۔ کچھ لوگ لیڈروں کی زبان سے "اردو، اردو اور وطن، وطن" کا شور سن کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ سچ مچ اس سرزمین میں ہر طرف اردو ہی اردو نظر آئے گی اور انگریزی کو کوئی پوچھے گا نہیں۔ یعنی رانی باندی بن جائے گی اور باندی رانی کی جگہ لے لے گی۔ حالاں کہ ان کے کھانے کے دانت اور ہیں اور دکھانے کے اور۔ تحقیق کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج جو لوگ اردو، اردو کے نعرے لگا رہے ہیں ان میں سے اکثر گندم نما جَو فروش یا یوں کہنا چاہیے "اردو نما، انگریزی فروش" ہیں۔

☆O☆
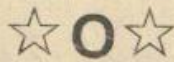
" چھاچھ کے ایک گلاس میں پانی کے دس گلاس ڈال دیجیے جب بھی چھاچھ ہی کہلائے گی۔ یہ اور بات ہے کہ ذرا پتلی ہو جائے گی۔ ہماری وزارت میں پہلے چار وزیر تھے۔ اب پانچ ہیں۔ سنا ہے عنقریب دو وزیروں کا اضافہ ہونے کو ہے لیکن وزارت ہر حال میں وزارت ہے۔ چار کی ہو، پانچ کی، سات کی ہو یا دس کی۔ گویا ہماری وزارت ربڑ کی ہے جب چاہا کھینچ کے لمبی کر لی۔ چھاچھ میں پانی ملایا جائے تو پتلی ہو جاتی ہے۔

وزارت کی چھاچھ میں پانی ملایا جائے تو گاڑھی ہو جاتی ہے۔"

☆O☆

" تین دن ہوئے لاہور کے تانگے والوں نے ہڑتال کر دی تھی اور ہڑتال بھی ایسی مکمل کہ شہر بھر میں مشکل ہی سے کوئی تانگا نظر آتا تھا۔ جن لوگوں کو سائیکلوں، موٹر سائیکلوں اور موٹر کاروں کا سہارا ہے، انھیں کیا پروا۔ لیکن جو لوگ ساری عمر تانگوں پر لدے رہے ہیں، ان کی جان آفت میں آ گئی، یعنی تانگوں کی بجائے ٹانگوں کا سہارا رہ گیا۔

ہمارے ملک میں مکمل ہڑتال شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ لیکن تانگا یونین بڑی تیز نکلی۔ جہاں کوئی تانگے والا تانگا چلاتا نظر آیا۔ یار لوگوں نے گھیر کے اس کا منہ کالا کر دیا۔ پرانا قاعدہ تو یہ ہے کہ منہ کالا کر کے گدھے پر الٹا سوار کر دیا جائے لیکن ان لوگوں نے گدھے کا کام تانگے سے لیا یعنی منہ کالا کر کے تانگے پر سوار کر دیا اور وہ بھی الٹا نہیں بلکہ سیدھا۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ ایک صاحب شاہی زمانے میں دلّی کے کوتوال تھے۔ رنگت کے بہت کالے تھے۔ ایک مرتبہ کوئی شخص کسی جرم میں پکڑا آیا۔ کوتوال صاحب نے فرمایا "اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر الٹا سوار کرو اور سارے شہر میں پھراؤ"۔

مجرم بولا۔ "صاحب! اور جو سزا چاہے دے دیجیے، یہ سزا نہ دیجیے"۔

کوتوال صاحب نے پوچھا۔ "یہ کیوں؟"۔ جواب ملا۔ "لوگ سمجھیں گے کہ کوتوال صاحب گدھے پر سوار ہو کے شہر کی سیر کر رہے ہیں"۔

☆O☆
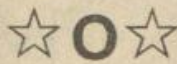
" کچھ لوگ شکار کھیلنے جا رہے تھے۔ ان کے ایک دوست، جنھیں شکار سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا، ساتھ ہو لیے۔ دوستوں نے سمجھا دیا تھا کہ میاں جنگل میں نہ تو بات ہی کیجیو، نہ آہٹ ہی ہونے پائے، ورنہ شکار ہاتھ نہیں آئے گا۔ تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ تالاب کے کنارے تیتر نظر آئے۔ نئے شکاری نے انگریزی میں کہا۔ "وہ رہے تیتر"

اور سارے تیتر اُڑ گئے۔ دوستوں نے کہا ''بھئی یہ تم نے کیا کیا؟'' کہنے لگے ''مجھے یہ کب معلوم تھا کہ تیتر بھی انگریزی سمجھنے لگ گئے ہیں''۔

ہمارے کچھ سیاست دانوں نے ساری عمر شکار نہیں کیا۔ یونہی وقت گزارنے کے لیے سیاست دانوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ تیتر ذرا نازک مزاج ہیں۔ ادھر آپ نے بات کی اور اُدھر وہ پھُر سے اُڑ گئے۔ کچھ سیاست دان تو تیتر بھی ہیں اور بیٹر بھی۔ وزارت کی بہاریں بھی دیکھی ہیں، لیڈری کی کبڈی بھی کھیلی ہے، اردو بھی جانتے ہیں، انگریزی بھی سمجھتے ہیں۔ اگر ان کے کسی بیان کے ساتھ ان کی پارٹی کے تیتر بلکہ ان کے ساتھ ساتھ کچھ کبوتر بھی اڑ جائیں تو انھیں معذور سمجھنا چاہیے۔"

(حرف وحکایت)

☆O☆
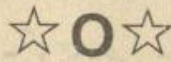
سوالات

1۔ سبق کا متن مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

i- کالم نگار نے شیر فروش کو جرمانے سے بچنے کے لیے مشورہ دیا۔

(الف) دودھ میں پانی ملانے کا

(ب) پانی میں دودھ ملانے کا

(ج) خالص دودھ بیچنے کا

ii- کالم نگار نے بھینس سے کیا مُراد لیا ہے؟

(الف) عوام

(ب) خواص

(ج) حکومت

iii- کالم نگار نے کن کے بارے میں کہا ہے کہ اُن کے کھانے کے دانت اور ہیں اور دکھانے کے اور؟

(الف) سیاست دانوں کے

(ب) لیڈروں کے

(ج) حکومتی اہل کاروں کے

2- سبق کا متن مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

i- مَثل ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' سے کیا مُراد ہے؟

ii- کالم نگار نے اُردو اُردو کے نعرے لگانے والے اکثر لیڈروں کے بارے میں کیا کہا ہے؟

iii- کالم نگار نے کس زبان کو رانی اور کس زبان کو باندی کہا ہے؟

iv- کالم نگار نے وزارت کو چھاچھ سے کیوں تشبیہ دی ہے؟

v- چراغ حسن حسرت نے کچھ سیاست دانوں کو تیتر اور بٹیر کیوں کہا ہے؟

3- مندرجہ ذیل الفاظ و محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

اناڑی۔ پروان چڑھنا۔ کان کھڑے ہونا۔ پسیجنا۔ شاذ و نادر۔

4- ان کالموں میں سے آپ کو کون سا کالم پسند ہے؟

5- مندرجہ ذیل جملے دیکھیے۔

یہ گلاب کا پھول ہے۔ **وہ** میرا بھائی ہے۔ **اُس** کتاب کو اُٹھا لاؤ۔

ان جملوں میں نمایاں کیے گئے الفاظ کسی شخص یا چیز کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، ایسے الفاظ کو اسمِ اشارہ کہتے ہیں۔

آپ اس سبق میں سے اسمِ اشارہ کی پانچ مثالیں تلاش کیجیے۔

☆O☆
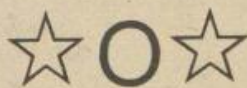
مکتوباتِ عبدالحق

مولانا غلام رسول مہر کے نام

حبشی گوڑہ، حیدر آباد دکن،

3 اگست 1942ء

شفیقی ومکرمی زَادَ لُطفکُم -- السلام علیکم!

آج پورے دو ہفتے ہوتے ہیں کہ میں بلدۂ حیدر آباد فرخندہ بنیاد میں ہوں۔ انجمن کی امداد چھے سال کے لیے منظور ہوئی تھی۔ اب اس کوشش میں ہوں کہ یہ امداد دوامی ہو جائے۔ اس کے لیے بڑی تگ ودو اور جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔ ابھی سے دوڑ دھوپ شروع کردی ہے۔ یہ ہو جائے تو پھر اطمینان سے کام کروں اور ممکن ہے کہ انجمن کچھ ایسے کام کرسکے، جو یادگار ہوں۔

اس تگ ودو میں بعض اوقات مجھے ایسے حضرات کے دروازوں پر بھی حاضر ہونا پڑتا ہے جن سے کبھی ملنا بھی عار سمجھتا تھا لیکن انجمن کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس کُوچے میں ہر ذلّت عزّت ہے۔

مجھ پر دو وقت ایسے گزرتے ہیں جب میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس کام کو میں نے اپنے سر لیا ہے اس کا اہل نہیں ہوں۔ ایک تو اس وقت جب میں کسی سے چندہ مانگنے جاتا ہوں، بہت کچھ سوچ کے جاتا ہوں لیکن مانگتے وقت زبان بند ہو جاتی ہے اور آنکھیں جھک جاتی ہیں، غیرت مانع ہوتی ہے۔ دوسرے جب کسی سے معاملہ کرنے بیٹھتا ہوں۔ کاروباری آدمی کی طرح اس طرح سودا کرنا کہ پسینا آجاءے مجھے نہیں آتا اور مروّت غالب آجاتی ہے۔ ان کاموں کے لیے ڈھٹائی کی ضرورت ہے۔ یہ وصفِ شریف فطرتی ہوتا ہے۔ سیکھنے سے نہیں آتا اور مشکل یہ ہے کہ ڈھیٹ بنو تو بناوٹ کُھل جاتی ہے۔ دعا کیجیے کہ اس کوشش کا انجام بخیر ہو۔

آج کل یہاں کا موسم نہایت پُر لطف اور خوش گوار ہے۔ حیدر آباد رشکِ کشمیر بنا ہوا ہے۔ یہاں آکر دلّی کی گرمی اور گھمس بالکل بھول گیا ہوں۔ اچھی خاصی خنکی ہے اور ہر

وقت ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ حیدر آباد کی سیر کرنی ہو تو آج کل آیئے اور میرے ہوتے آیئے۔ کبھی کبھی تو اس بدعت کا ارتکاب بھی کر لیا کیجیے۔ آٹھوں پہر کی سر مغزن سے کچھ تو نجات ملے۔ روزانہ اخبار بھی ایک بلا ہے۔ جھاڑ ہو کر لپٹ جاتا ہے۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہو گا۔

نیاز مند

عبدالحق

☆O☆

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام

انجمنِ ترقی اُردو پاکستان

ہسپتال روڈ، کراچی

15 مارچ 1951ء

عزیز من سلّمہ،

کتاب کا مسودہ پہنچ گیا۔ تم اکثر علیل رہتے ہو۔ یہ اچھا نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تم وہاں کے حالات سے پریشان خاطر ہو اور کُڑھتے رہتے ہو۔ جذباتی آدمی کے لیے زندگی بہت کٹھن ہو جاتی ہے۔ روز مرّہ کی معمولی الجھنیں اس کے لیے سوہانِ رُوح ہو جاتی ہیں۔ یہ زندگی کے پیچ و خم ہیں، انھیں چار و نا چار سہنا پڑتا ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ آدمی ان سے زیادہ متاثر نہ ہو اور اپنا کام کیے جائے۔ تم جس قدر ان باتوں پر زیادہ سوچ بچار کرو گے اور ذرا ذرا سی باتوں کا اثر قبول کرو گے، اسی قدر طبیعت کو زیادہ کوفت ہو گی اور رفتہ رفتہ زندگی تلخ ہو جائے گی اور اس کا اصل کام پر بھی بُرا اثر پڑے گا۔ زندگی کے ہر موڑ پر انسان کو نئے تجربے ہوتے ہیں۔ ان تردّدات کو بھی تجربے ہی تصوّر کر لو۔ شاید آیندہ کام آئیں۔ داغؔ نے خوب کہا ہے اگرچہ اس پر عمل مشکل ہے۔

دن گزارے عمر کے انسان ہنستے بولتے

جان بھی جائے تو میری جان ہنستے بولتے

خیر طلب

عبدالحق

سوالات

1۔ متن کو مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیے۔

i۔ مولوی عبدالحق نے اپنا سب کچھ کس کام کی خاطر وقف کر رکھا تھا؟

ii۔ مولوی عبدالحق دوسروں کے دروازوں پر کس مقصد کے تحت جاتے تھے؟

iii۔ بابائے اُردو نے زندگی کی تلخیوں سے بچنے کے لیے کیا نسخہ تجویز کیا ہے؟

2۔ مندرجہ ذیل الفاظ و محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

تگ و دو۔ دوڑ دھوپ کرنا۔ عار سمجھنا۔ سر لینا۔ ڈھٹائی۔ بدعت۔

3۔ پہلے خط میں ''پسینا'' کا لفظ ''الف'' سے لکھا گیا ہے، یہ ہندی لفظ ہے۔ ایسے الفاظ کے آخر میں ''ہائے مختفی'' کے بجائے ''الف'' آتا ہے۔ اس اُصول کی روشنی میں مندرجہ ذیل الفاظ کا املا درست کیجیے۔

بھروسہ، پتہ، چپہ، دھبہ، دھوکہ، ڈاکہ، ڈیرہ، سمجھوتہ۔

4۔ کالم (الف) میں آپ کے نصاب میں شامل اسباق کے عنوانات لکھے گئے ہیں جب کہ کالم (ب) میں مصنفین کے نام دیے گئے ہیں۔ آپ کالم (ج) میں ہر سبق کے عنوان کے سامنے اس کے مصنف کا نام لکھیے۔

(الف)	(ب)	(ج)
رسولِ اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَاٰلِهِ وَسَلَّم کے اخلاق	مولانا الطاف حسین حالی	
ایک خادمِ خلق کی کہانی	پطرس بخاری	
سویرے جو کل آنکھ میری کھلی	سر سید احمد خان	
یتیم شہزادے کی ٹھوکریں	سید سلیمان ندوی	
بڑے بھائی صاحب	چودھری افضل حق	
مرزا غالب کے عادات و خصائل	منشی پریم چند	
	خواجہ حسن نظامی	

5۔ مندرجہ ذیل جملوں کو غور سے پڑھیں۔

i۔ممتاز نے آم اور آڑو خریدے

ii۔میجر عزیز بھٹی شہید نے جرأت و شجاعت کا بے مثال مظاہرہ کیا۔

iii۔مریحہ نے ناشتا کیا اور اسکول چلی گئی۔

پہلے دو جملوں میں 'اور' اور 'و' نے دو دو لفظوں کو جوڑا ہے جب کہ تیسرے جملے میں 'اور' کی مدد سے دو جملوں کو جوڑا گیا ہے۔ 'اور' اور 'و' کو حروفِ عطف کہتے ہیں۔

آپ اس سبق سے پانچ ایسے جملے تلاش کیجیے جن میں حرفِ عطف استعمال کیا گیا ہو۔

☆O☆

حصّہ
نظم

مولانا ظفر علی خاں
(1873ء-1956ء)
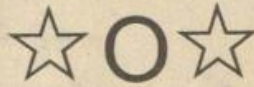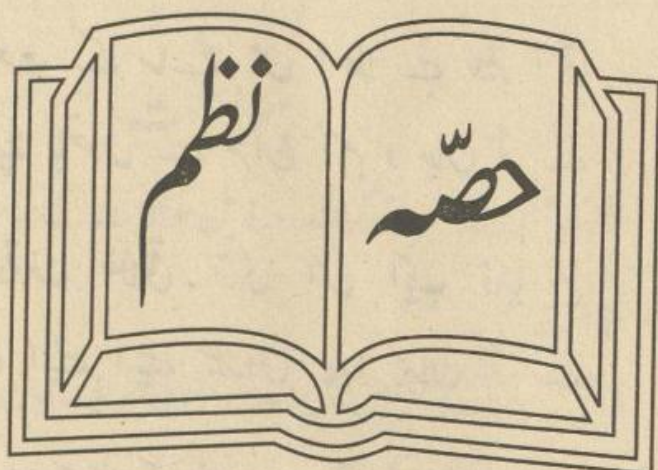
رَبُّ العالمین

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تُو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تُو نے

تری صنعت کے سانچے میں ڈھلا ہے پیکرِ ہستی
سمویا اپنے ہاتھوں سے مزاجِ جسم و جاں تُو نے

نہیں موقوف خلاّقی تری اس ایک دُنیا پر
کیے ہیں ایسے ایسے سیکڑوں پیدا جہاں تُو نے

دلوں کو معرفت کے نور سے تُو نے کیا روشن
دکھایا بے نشاں ہو کر ہمیں اپنا نشاں تُو نے

ہم اب سمجھے کہ شاہنشاہِ مُلکِ لامکاں تُو ہے
بنایا اک بشر کو سرورِ کون و مکاں تُو نے

چلے ہم نقدِ عصیاں لے کے آمُرزش کے سودے کو
کہ نرخ اس جنس کا کچھ بھی نہیں رکھا گراں تُو نے

اثر تیری عطاؤں پر نہیں پڑتا خطاؤں کا
جسے پیدا کیا اُس کو دیا ہے آب و ناں تُو نے

محمدؐ مصطفےٰ کی رحمتُ اللعالمینی سے
بڑھائی یارب اپنے لُطف اور احساں کی شاں تُو نے

ترِے دربار سے مجھ کو یہی انعام کیا کم ہے
کِیا اپنی ستائش میں مجھے رطب اللِساں تُو نے

سوالات

1۔ نظم کا متن مدِّ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں

i- ایسی نظم جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی جائے کہلاتی ہے
(الف) حمد (ب) نعت (ج) منقبت

ii- شاہنشاہِ مُلکِ لامکاں نے سرورِ کون ومکاں بنایا ہے
(الف) ایک فرشتے کو (ب) ایک بشر کو (ج) ایک جن کو

iii- محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَالِہٖ وَسَلَّم کی رحمت اللعالمینی سے اللہ نے کِس کی شان بڑھائی
(الف) اپنے لُطف واحسان کی (ب) انسان کی
(ج) زمین وآسمان کی

2۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

i- ''حمد'' کس نظم کو کہتے ہیں؟

ii- اردو کے کسی اور شاعر کی معیاری ''حمد'' اپنی کاپی میں لکھیے۔

iii- حمد کے اس شعر کا مفہوم واضح کیجیے۔

اثر تیری عطاؤں پر نہیں پڑتا خطاؤں کا

جسے پیدا کیا اُس کو دیا ہے آب و ناں تُو نے

3۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

حکمت ۔ خلّاقی ۔ معرفت ۔ موقوف ۔ ستائش

4۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے مترادف لکھیے۔

حکمت ۔ آسمان ۔ جہان ۔ بشر ۔ لطف

5۔ درج ذیل الفاظ کا تلفُّظ اِعراب کی مدد سے واضح کریں۔

صنعت ۔ معرفت ۔ آمرزش ۔ گراں ۔ رحمت اللعالمینی

☆O☆

بہزاد لکھنوی

(1904ء-1974ء)
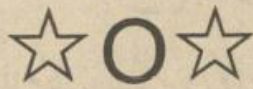
نعت

مدینے دل و روح و جاں لے کے جاؤں
محبت کا سارا جہاں لے کے جاؤں

جو سرگرم رہتی ہے ان کی ثنا میں
وہ فکرِ سخن، وہ زباں لے کے جاؤں

بھلا دوں جو کاذب ہے رُوداد میری
جو حق ہے وہی داستاں لے کے جاؤں

محمد ﷺ محمد ﷺ ہو ہونٹوں پہ میرے
میں ایماں کی گل کاریاں لے کے جاؤں

نہ چھوٹے کبھی یہ دیارِ مدینہ
یہ حسرت سرِ آستاں لے کے جاؤں

جو تڑپا رہا ہے مری زندگی کو
وہی دل کا دردِ نہاں لے کے جاؤں

نہیں لائقِ نذر بہزاؔد کچھ بھی
مَیں کیا پیشِ شاہِ شہاں لے کے جاؤں

سوالات

1۔ نظم کا متن مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں

i- ایسی نظم جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف بیان کی جائے کہلاتی ہے

(الف) حمد (ب) نعت (ج) منقبت

ii- شاعر نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثنا میں، کس کے سرگرم رہنے کی بات کی ہے؟

(الف) زبان کی (ب) قلم کی (ج) جسم وجان کی

2۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

i- کس نظم کو نعت کہتے ہیں؟

ii- بہزاد لکھنوی نے اس نعت میں کن آرزوؤں کا اظہار کیا ہے؟

iii- اس نعت کے ان اشعار کی تشریح کیجیے۔

جو سرگرم رہتی ہے ان کی ثنا میں
وہ فکرِ سخن، وہ زباں لے کے جاؤں

نہ چھوٹے کبھی یہ دیارِ مدینہ
یہ حسرت سرِ آستاں لے کے جاؤں

نہیں لائقِ نذر بہزاد کچھ بھی
مَیں کیا پیشِ شاہِ شہاں لے کے جاؤں

☆O☆

نظیر اکبر آبادی

(1735ء-1830ء)

برسات

برسات کا جہاں میں لشکر پھسل پڑا　　بادل بھی ہر طرف سے ہوا پر پھسل پڑا
جھڑیوں کا مینہ بھی آ کے سراسر پھسل پڑا　　چھتا کسی کا شور مچا کر پھسل پڑا
کوٹھا جھکا، اٹاری گری دَر پھسل پڑا

جن کے نئے نئے تھے مکاں اور محل سرا　　ان کی چھتیں ٹپکتی ہیں، چھلنی ہو جا بجا
دیواریں بیٹھتی ہیں چھلوں کا ہے غل مچا　　لاٹھی کو ٹیک کر جو ستوں ہے کھڑا، تو کیا
چھجا گرا منڈیری کا پتھر پھسل پڑا

جھڑیوں نے اس طرح کا دیا آ کے جھڑ لگا　　سُنیے جدھر اُدھر کو دھڑا کے کی ہے صدا
کوئی پکارے ہے مرا دروازہ گر چلا　　کوئی کہے ہے ہائے کہوں تم سے اب میں کیا
تم در کو جھینکتے ہو مرا گھر پھسل پڑا

یاں تک ہر اک مکاں کی پھسلنے لگی زمیں　　نکلے جو گھر سے اس کو پھسلنے کا ہے یقیں
مفلس غریب پر ہی یہ موقوف کچھ نہیں　　کیا فیل کا سوار ہے کیا پالکی نشیں
آیا جو اس زمین کے اوپر پھسل پڑا

دیکھو جدھر تدھر کو یہی غُل پکار ہے　　کوئی پھنسا ہے اور کوئی کیچڑ میں خوار ہے
پیادا اُٹھا جو گر کے تو چھکڑا سوار ہے　　گرنے کی دھوم دھام یہ کچھ بے شمار ہے
جو ہاتھی رپٹا اونٹ گرا خر پھسل پڑا

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا　　کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا　　اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ بچا
وہ اپنے گھر کے صحن میں آ کر پھسل پڑا

سوالات

1۔ نظم کا متن مدِنظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں۔

i- اس نظم میں نظیر اکبرآبادی نے برسات کے کیا کیا مناظر بیان کیے ہیں۔

ii- اس نظم کے کس بند سے آپ محظوظ ہوئے۔ وجہ بیان کیجیے۔

iii- اس نظم کا مرکزی خیال لکھیے۔

iv- نظم کے اس بند کی تشریح کیجیے۔

یاں تک ہر اک مکاں کی پھسلنے لگی زمیں　　نکلے جو گھر سے اس کو پھسلنے کا ہے یقیں
مفلس غریب پر ہی یہ موقوف کچھ نہیں　　کیا فیل کا سوار ہے کیا پالکی نشیں
آیا جو اس زمین کے اوپر پھسل پڑا

2۔ اس نظم میں ''پھسل پڑنا'' ایک مصیبت کے طور پر آیا ہے۔ اس مصیبت کا شکار ہونے والوں کی نشان دہی کریں۔

☆O☆

حفیظ جالندھری
(1900ء-1982ء)

حضرت اُمِّ عمارہؓ

اُحُد میں خدمتیں جن کی بہت ہی آشکارا تھیں
انھیں میں ایک بی بی حضرت اُمِ عمارہؓ تھیں

پئے اسلام دے کر اپنے فرزندوں کی قربانی
پلاتی تھیں یہ بی بی زخمیانِ جنگ کو پانی

نبیؐ کی ذات پر جب جھک پڑے ایمان کے دشمن
ہوئے اس زندگی بخشِ جہاں کی جان کے دشمن

اسی شمعِ ہُدیٰ پر جب پلٹ کر آ گئی آندھی
تو اس بی بی نے رکھ دی مشک، چادر سے کمر باندھی

تھے اس کے شوہر و فرزند بھی مصروفِ جاں بازی
رسُول اللہؐ پر قربان تھے اللہ کے غازی

ہوئی یہ شیر زن بھی اب قتال و جنگ میں شامل
سپر بن کر لگی پھرنے بگردِ ہادیِ کاملؐ

یہ اپنی جان پر ہر زخم دامن گیر لیتی تھی
کوئی حربہ وجودِ پاک تک آنے نہ دیتی تھی

نظر آئی نئی صورت جو حرزِ جانِ پیغمبرؐ
کیا یک لخت بڑھ کر حملہ اک بدکیش نے اُس پر

نہتی تھی مگر کرنے لگی پیکار دُشمن سے
مروڑا اُس کا بازو چھین لی تلوار دُشمن سے

اسی شمشیر سے اُس نے سرِ شمشیر زن کاٹا
ہُوا اس شیر زن کے خوف سے اعدا میں سنّاٹا

جدھر بڑھتے ہوئے پاتی تھی یہ محبوبِ باریؐ کو
پہنچتی تھی وہیں اُمِ عمارہؓ جاں نثاری کو

سر و گردن پہ اُس بی بی نے تیرہ زخم کھائے تھے
مگر میدان سے اس کے قدم ہٹنے نہ پائے تھے

یہ اُٹھی تھی نمازِ صبح کو تاروں کے سائے میں
نمازِ ظہر تک قائم تھی تلواروں کے سائے میں

فرشتے دنگ تھے اس تیغِ ایمانی کے جوہر سے
کہ حاضر تھی یہ جان و مال سے فرزند و شوہر سے

یہی مائیں ہیں جن کی گود میں اسلام پلتا ہے
اسی غیرت سے انساں نور کے سانچے میں ڈھلتا ہے

سوالات

1۔ حضرت اُم عمارہؓ کی بہادری اور جاں بازی کا واقعہ اپنے الفاظ میں لکھیے

2۔ نظم کے اس شعر کی تشریح کیجیے۔

یہی مائیں ہیں جن کی گود میں اسلام پلتا ہے
اسی غیرت سے انساں نور کے سانچے میں ڈھلتا ہے

3۔ درج ذیل الفاظ پر اِعراب لگا کر تلفُّظ واضح کیجیے۔

قتال۔ حرز جان۔ بدکیش۔ اعدا۔ سناٹا

4۔ اس نظم کا مرکزی خیال لکھیے۔

5۔ مندرجہ ذیل الفاظ و محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

آشکارا۔ جان کا دُشمن ہونا۔ شمعِ ہُدیٰ۔ کمر باندھنا۔ دامن گیر ہونا۔ بدکیش۔ دنگ رہ جانا۔

6۔ ان الفاظ کے ہم آواز الفاظ لکھیے۔

آشکارا۔ ایمان۔ شامل۔ پیکار۔ جوہر۔ پلتا۔

☆O☆

احسان دانش

(1914ء-1982ء)

تعمیرِ چمن

جس طرح ممکن ہو تعمیرِ چمن کرتے رہو
کام اپنا اے محبّانِ وطن کرتے رہو

زندگی یکسر محرک ہے سکوں یکسر ہے موت
کچھ نہ کچھ اے نوجوانانِ وطن کرتے رہو

پتّی پتّی پر چمن کی جان چھڑکو دوستو
رات دن خدماتِ اربابِ چمن کرتے رہو

آندھیوں کا کیا بھروسا، کیا بگولوں کا یقیں
روز اونچی اپنی دیوارِ چمن کرتے رہو

لطف ہی کیا ہے اگر بولے نہ ہر رُخ سے جنوں
ہوش سے بچتے چلو دیوانہ پن کرتے رہو

یوں ہی قطرہ قطرہ ہو جاتا ہے بحرِ بے کراں
غم نصیبوں کو شریکِ انجمن کرتے رہو

کاش تہذیبِ نوِی کے کھیل کو سمجھو سراب
کاش تقلیدِ روایاتِ کہن کرتے رہو

انتشار اِک پیش نامہ ہے زوالِ مُلک کا
اتحادِ قوم و ملّت کا جتن کرتے رہو

دوسری احسان دانشؔ کچھ نہیں اس کے سوا
زندگی بھر اعترافِ حُسنِ ظن کرتے رہو

سوالات

1۔ نظم کا متن مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں

i- تعمیرِ چمن سے شاعر کی مُراد ہے۔

(الف) باغ کی تعمیر (ب) گھر کی تعمیر

(ج) مُلک وقوم کی تعمیر

ii- دیوانہ پن سے شاعر کا مقصود ہے

(الف) پاگل پن (ب) بے وقوفی

(ج) وطن سے بے لوث محبت

iii- اس نظم میں تہذیبِ نوی کا مطلب ہے

(الف) سائنسی دور کی خوبیاں (ب) مغربی تہذیب کی اچھائیاں

(ج) نئی تہذیب کی بُرائیاں

iv- انتشار وجہ بنتا ہے

(الف) ترقی کی (ب) عروجِ قوم کی

(ج) زوالِ قوم کی

2۔ نظم تعمیرِ وطن میں شاعر نے کیا پیغام دیا ہے؟

3۔ اس نظم کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھیے۔

4۔ اس شعر کی تشریح کیجیے۔

زندگی یکسر محرک ہے سکوں یکسر ہے موت
کچھ نہ کچھ اے نوجوانانِ وطن کرتے رہو

نعیم صدیقی
(1916ء-2002ء)

خُدا دیکھ رہا ہے

اے دانشِ عیّار! خدا دیکھ رہا ہے
اے خواہشِ سرشار! خدا دیکھ رہا ہے

اے قلبِ فُسوں کار! خدا دیکھ رہا ہے
اے دیدۂ پُر کار! خدا دیکھ رہا ہے

ہنگامۂ افکار! خدا دیکھ رہا ہے
پنہاں ہے جو اسرار خدا دیکھ رہا ہے

رنگین غلافوں میں چھُپاتے ہیں جنھیں ہم
روحوں کے وہ آزار ، خدا دیکھ رہا ہے

کن فتنوں کا ہے قلزمِ باطن میں تموُّج
اے مردِ ریا کار! خدا دیکھ رہا ہے

جورِ سرِ بازار تو ہے سب کی نظر میں
جُرمِ پسِ دیوار! خدا دیکھ رہا ہے

رنگینئ گُفتار سے مسحور ہے محفل
اور غایت گفتار! خدا دیکھ رہا ہے

جلوت میں تو کچھ پاس رہا خلقِ خدا کا
خلوت میں بھی سرکار! خُدا دیکھ رہا ہے

صد حا یہ مقام کہ بھُلا بیٹھے خدا کو
کیا جیت ہے، کیا ہار! خدا دیکھ رہا ہے

ایمان کا عنوان لگا رکھا ہے جس پر
وہ جذبۂ بیمار، خدا دیکھ رہا ہے

دنیا تیرے کرتوت کو دیکھے کہ نہ دیکھے
اے مرے دلِ زار! خدا دیکھ رہا ہے

سوالات

1۔ اس نظم میں ''جذبۂ بیمار'' سے کیا مُراد ہے۔
2۔ اس نظم سے اپنی پسند کے دو اشعار چُنیے اور پسند کی وجہ لکھیے۔
3۔ نظم ''خُدا دیکھ رہا ہے'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔
4۔ نظم کے ان اشعار کی تشریح کیجیے۔

اے دانشِ عیّار! خدا دیکھ رہا ہے
اے خواہشِ سرشار! خدا دیکھ رہا ہے

اے قلبِ فُسوں کار! خدا دیکھ رہا ہے
اے دیدۂ پُر کار! خدا دیکھ رہا ہے

☆O☆

جمیل الدین عالی
(1926ء)
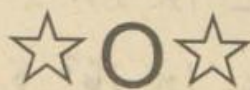
خواب کی تعبیر

پھر شوقِ عمل فکر کا ہم راز ہُوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے
اے صیدِ زبوں تیرے لیے گھوم رہی ہیں
آزاد فضائیں
اے جذبِ جنوں تیرے لیے جھوم رہی ہیں
یہ تازہ ہوائیں

پھر سوزِ دروں زمزمہ پرداز ہُوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے
کُچھ روشنیاں صاف نظر آنے لگی ہیں
لہرانے لگی ہیں
کُچھ آرزوئیں حسنِ بیاں پانے لگی ہیں
بَر آنے لگی ہیں

پھر عشق کا موسم اثر انداز ہُوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے
اے ہم سفرو، فکر و عمل کے یہ خزانے
بخشے ہیں خُدا نے
اے ہم سخنو ، گاؤ نئے زندہ ترانے
کیا راگ پرانے

پھر سارا جہاں گوش بر آواز ہُوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہُوا ہے

سوالات

1۔ ''شوقِ عمل اور فکر'' سے کیا معنی لیے گئے ہیں وضاحت کیجیے۔

2۔ اس نظم میں ''خواب کی تعبیر'' کے آغاز کی کون کون سی نشانیاں بتائی گئی ہیں۔

3۔ مندرجہ ذیل مرکبات کو اپنے جُملوں میں استعمال کیجیے۔

صیدِ زبوں۔ سوزِ دروں۔ زمزمہ پرداز۔ جذبِ جنوں

4۔ نظم کے اس بند کی تشریح کیجیے۔

پھر سوزِ دروں زمزمہ پرداز ہُوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے
کُچھ روشنیاں صاف نظر آنے لگی ہیں
لہرانے لگی ہیں
کُچھ آرزوئیں حسنِ بیاں پانے لگی ہیں
بَر آنے لگی ہیں

☆O☆

سید ضمیر جعفری
(1918ء-1999ء)

کھڑا ڈنر

"بفے دعوت" پہ بلوایا گیا ہوں
پلیٹیں دے کے بہلایا گیا ہوں

کبھی باتوں میں اُلجھایا گیا ہوں
کہیں کرسی سے ٹکرایا گیا ہوں

نہ آئی پر نہ آئی میری باری
پلاؤ تک بہت آیا گیا ہوں

کبابوں کی رکابی ڈھونڈنے کو
کئی مِیلوں میں دوڑایا گیا ہوں

برائے قتلِ قتلہ ہائے ماہی
چُھری کانٹے سے لڑوایا گیا ہوں

مٹر کے واسطے جب کی مٹر گشت
تو "آلو گوشت" میں پایا گیا ہوں

ضیافت کے بہانے درحقیقت
مشقت کے لیے لایا گیا ہوں

سوالات

1۔ نظم کا متن مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں

i- شاعر کو بہلایا گیا۔
(الف) مشروب دے کر (ب) پلیٹیں دے کر (ج) حلوہ دے کر

ii- شاعر کس رکابی کے لیے دوڑا۔
(الف) کبابوں کی (ب) مرغ کی (ج) مچھلی کی

iii- شاعر نے مٹر گشت کی۔
(الف) پلاؤ کے لیے (ب) آلو گوشت کے لیے (ج) مٹر کے لیے

iv- شاعر کے بقول اُسے درحقیقت لایا گیا
(الف) مشقت کے لیے (ب) بات چیت کے لیے
(ج) کھانا کھانے کے لیے

2۔ نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

3۔ ''بفے دعوت'' سے کیا مُراد ہے؟

4۔ شاعر نے اس نظم میں ہمارے کس معاشرتی رویے پر طنز کیا ہے؟

5۔ نظم کے ان اشعار کی تشریح کریں۔

مٹر کے واسطے جب کی مٹر گشت
تو ''آلو گوشت'' میں پایا گیا ہوں
ضیافت کے بہانے درحقیقت
مشقت کے لیے لایا گیا ہوں

☆○☆

شاہ عبداللطیف بھٹائی
(1689ء-1752ء)

وصال

گھڑا ٹوٹا تو یہ آواز آئی
نہیں دونوں میں اب کوئی جدائی

شکستِ جسمِ خاکی سے ہے پیدا
رُبابِ رُوح کی نغمہ سرائی

وصالِ یار کی راحت پہ قرباں
طریقِ زہد و رسمِ پارسائی

گھڑا کچّا ہے میرے سر پہ چھائے
برستی رات کے گھنگھور سائے

فضا ایسی کہ جیسے شیر کوئی
کہیں بیٹھا ہو اپنا سر اُٹھائے

سہارا دے مجھے جوشِ محبت
کمی جوشِ محبّت میں نہ آئے

نڈر ہو کے مَیں اب دریا میں اُتروں
بلا سے نجان جاتی ہے تو جائے

(ترجمہ کلامِ بھٹائی، مترجم: شیخ ایاز)

سوالات

1۔ اس نظم کا مرکزی خیال لکھیے۔

2۔ اس نظم میں استعمال ہونے والے ہم آواز الفاظ کی نشان دہی کیجیے۔

3۔ اس نظم کا خلاصہ لکھیے۔

4۔ شاعر نے ''کچّے گھڑے'' سے کیا مُراد لیا ہے؟

5۔ نظم کے اس شعر کی تشریح کیجیے۔

نڈر ہو کے مَیں اب دریا میں اُتروں
بلا سے جان جاتی ہے تو جائے

☆O☆

میر تقی میر
(1723ء-1810ء)

غزل

میر دریا ہے سُنے شعر زبانی اُس کی
اللّٰہ اللّٰہ رے طبیعت کی روانی اُس کی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اُس کی

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پہ ملی خاک میں سب سحر بیانی اُس کی

سرگزشت آپ ہی کس اندوہ سے سب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سنی ہائے ، کہانی اُس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی ، پھوٹ بہے
دردمندی میں کٹی ساری جوانی اُس کی

اب گئے اُس کے جُز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف! کہ کچھ قدر نہ جانی اُس کی

سوالات

1۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

i- شعری اصطلاح میں مطلع سے کیا مُراد ہے؟

ii- میر تقی میرؔ کی اس غزل سے ''مطلع'' الگ کر کے لکھیے۔

iii- ''میر دریا ہے'' سے کیا مُراد ہے؟

2۔ مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

پراگندہ مزاج۔ سحر بیانی۔ خاک میں ملنا۔ سرگزشت۔ اندوہ۔ پھوٹ بہنا

3۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پہ ملی خاک میں سب سحر بیانی اُس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی، پھوٹ بہے
دردمندی میں کٹی ساری جوانی اُس کی

☆O☆

بہادر شاہ ظفر

(1775ء-1862ء)

غزل

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائدار میں

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں

ان حسرتوں سے کہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغ دار میں

دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہوگئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کُنجِ مزار میں

کتنا ہے بد نصیب ظفؔر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

سوالات

1۔ بادشاہ ہونے کے باوجود بہادر شاہ ظفر کی اس غزل کے لفظ لفظ سے بے بسی اور بے کسی ٹپکتی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

2۔ تیسرے شعر میں "بلبل"، "باغباں"، "صیاد" اور "فصلِ بہار" کے الفاظ اپنے حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان الفاظ سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

3۔ i- شعری اصطلاح میں مقطع سے کیا مُراد ہے؟

ii- اِس غزل کے مقطع کی نشان دہی کیجیے اور اس میں بیان کی گئی تاریخی حقیقت پر روشنی ڈالیے۔

4۔ اس شعر کی تشریح کیجیے۔

بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں

☆O☆

مولانا حسرت موہانی
(1875ء-1951ء)

غزل

ہر حال میں رہا جو ترا آسرا مجھے
مایوس کر سکا نہ ہجومِ بلا مجھے

ہر نغمے نے انھیں کی طلب کا دیا پیغام
ہر ساز نے انھیں کی سنائی صدا مجھے

ہر بات میں انھیں کی خوشی کا رہا خیال
ہر کام سے غرض ہے انھیں کی رضا مجھے

رہتا ہوں غرق ان کے تصوّر میں روز و شب
مستی کا پڑ گیا ہے کچھ ایسا مزا مجھے

اُس بے نشاں کے ملنے کی حسرتؔ ہوئی امید
آبِ بقا سے بڑھ کے ہے زہرِ فنا مجھے

سوالات

1- اس غزل کے مطلع کی تشریح کیجیے۔

2- مقطع میں شاعر نے کس سے ملاقات کی امید کا اظہار کیا ہے؟

3- مندرجہ ذیل مرکبات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

ہجومِ بلا۔ روز وشب۔ آبِ بقا۔

4- اس شعر کی تشریح کیجیے۔

رہتا ہوں غرق ان کے تصور میں روز وشب

مستی کا پڑ گیا ہے کچھ ایسا مزا مجھے

☆O☆

جگر مُراد آبادی
(1890ء - 1960ء)

غزل

ہم کو مٹا سکے ، یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

بے فائدہ الم نہیں بے کار غم نہیں
توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں

میری زباں پہ شکوۂ اہلِ ستم نہیں
مجھ کو جگا دیا ، یہی احسان کم نہیں

یارب ، ہجومِ غم کو دے اور وسعتیں
دامن تو کیا ابھی مری آنکھیں بھی نم نہیں

شکوہ تو ایک چھیڑ ہے ، لیکن حقیقتاً
تیرا ستم بھی تیری عنایت سے کم نہیں

ملتا ہے کیوں مزہ ستمِ روز گار میں
تیرا کرم بھی خود جو شریکِ ستم نہیں

مرگِ جگرؔ پہ کیوں تری آنکھیں ہیں اشک بار
اک سانحہ سہی ، مگر اتنا اہم نہیں

سوالات

1۔ اس غزل کے مطلع کی نشان دہی کریں۔

2۔ دوسرے شعر میں شاعر نے کس چیز کو نعمت قرار دیا ہے؟

3۔ چوتھے شعر میں شاعر نے درد میں وسعتوں کا مطالبہ کیوں کیا ہے؟

4۔ مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

دم نہ ہونا۔ آنکھیں نم ہونا۔ اہلِ ستم۔ ستمِ روزگار۔ اشک ریز۔ سانحہ۔ شکوہ

5۔ اس غزل کے مقطع کی نشان دہی کریں۔

6۔ اس شعر کی تشریح کیجیے۔

یارب ، ہجومِ غم کو دے اور وسعتیں
دامن تو کیا ابھی مری آنکھیں بھی نم نہیں

☆O☆

ادا جعفری
(1924ء)

غزل

یہ فخر تو حاصل ہے ، بُرے ہیں کہ بھلے ہیں
دو چار قدم ہم بھی ترے ساتھ چلے ہیں

جلنا تو چراغوں کا مقدّر ہے ازل سے
یہ دل کے کنول ہیں کہ بجھے ہیں نہ جلے ہیں

تھے کتنے ستارے کہ سرِ شام ہی ڈوبے
ہنگامِ سحر کتنے ہی خورشید ڈھلے ہیں

جو جھیل گئے ہنس کے کڑی دھوپ کے تیور
تاروں کی خنک چھاؤں میں وہ لوگ جلے ہیں

اک شمع بجھائی تو کئی اور جلا لیں
ہم گردشِ دوراں سے بڑی چال چلے ہیں

سوالات

1۔ اس غزل کے مطلع کی نشان دہی کیجیے۔

2۔ شاعرہ نے کس بات پر فخر کا اظہار کیا ہے؟

3۔ آخری شعر میں شاعرہ نے کس ''چال'' کا ذکر کیا ہے؟

4۔ اس شعر کی تشریح کیجیے۔

تھے کتنے ستارے کہ سرِشام ہی ڈوبے
ہنگامِ سحر کتنے ہی خورشید ڈھلے ہیں

☆O☆

فرہنگ

الف

ابد: دنیا کی آخری حد

ابنِ آدم: آدم کا بیٹا ' انسان

اپج: نئی بات جو کسی کو نہ سُوجھے

اترانا: غرور کرنا

اٹاری: بالا خانہ، چھت کے اوپر کا مکان

ارباب: رب کی جمع ، مالک، صاحب

ارتکاب: کسی کام کا کرنا

ارضِ ابدیت: دوامی سرزمین

ازبر: یاد، حفظ۔

اسباب: سامان

استخوان: ہڈی

استطاعت: طاقت

اَسرار: سر کی جمع۔ راز

اضطراب عظیم: شدید بے چینی

اعدا: عدو کی جمع۔ دشمن

افتاں وخیزاں: گرتے پڑتے

افق: آسمان کا کنارہ

اقلیدس: اشکال ریاضی اور ہندسے کا علم

الحاد: دینِ حق سے پھر جانا۔

الحاق: شامل ہونا
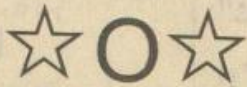
اللہ بس باقی ہوس: اللہ کے سوا باقی سب ہیچ ہے

اللہ مارا: بدبخت

امرت دھارا: بہت سی بیماریوں کی دوا

امتیاز: فرق

اندوختہ: جمع کیا ہوا

اناڑی: ناسمجھ، انجان، ناتجربہ کار، بے سلیقہ

انتشار: تتر بتر ہونا

ان شاء اللہ: اگر اللہ نے چاہا

اوچھا: کم گہرا

اوسان: ہوش وحواس

اہلے گہلے: خراماں خراماں

ایزدی: خدائی

ایشور: بھگوان۔ خدا

ایک بارگی: اچانک۔ ایک دفعہ

آ

آباواجداد: باپ دادا۔

آبِ حیات: امرت وہ پانی جس کے پینے سے آدمی کو کبھی موت نہیں آتی۔ فرضی پانی

آبدیدہ: وہ شخص جس کی آنکھ میں آنسو بھرے ہوں

آتشِ محبت: محبت کی آگ

آرزو: خواہش، تمنا

آزار: دکھ، رنج

آسمان سے باتیں کرنا: نہایت بلند ہونا

آسودگی: آرام

آشکارا: ظاہر، نمایاں

آفتابِ لبِ بام: نہایت بوڑھا

آمرزش: بخشش

آنکھیں سفید ہونا: اندھا ہونا

آہٹ: پاؤں کی آواز

آہ وبکا: چیخ پکار

ب

بارِ خاطر: ناگوار، ناپسند

باطن: ظاہر کا متضاد، چھپا ہوا

بالالتزام: لازمی، ضرور

بال روم (Ball Room): رقص گاہ

بالطبع: فطرتاً

باندی: لونڈی، کنیز

بانسا: دونوں نتھنوں کے بیچ کی ہڈی

باؤلی: سیڑھی والا کنواں

بدکیش: بے دین، بدخو

بحرِ بیکراں: ایسا سمندر جس کا کوئی کنارہ نہ ہو

بدعت: نیا رسم و رواج

برأت: چھٹکارا

بط: ایک قسم کا ساز

برحق: ٹھیک، درست

برخواستگی: برطرفی

برسبیل تذکرہ: تذکرے کے طور پر

برق رفتار: تیز رفتار

بگل: قرنا

بگولا: ہوا کا چکر

برہنہ شمشیر: ننگی تلوار

بساط: ہمت

بسیار: بہت زیادہ

بلاتامل: بغیر سوچے سمجھے، ہچکچاہٹ کے بغیر

بلا سے: کیا پروا ہے

بوتا: طاقت، زور

بہزار دقت: بہت مشکل سے

بھنور: گرداب

بھیرویں: ایک راگنی جو صبح کے وقت گائی جاتی ہے

بے برگ ونوا: بے سروسامان، عاجز

بے تکان: لگاتار

بَیر: دشمنی

بے ریا: بناوٹ کے بغیر، سیدھا اور صاف

بے سود: بے فائدہ

بیگار: اُجرت کے بغیر کام لینا، مفت کا کام

پ

پاپڑ بیلنا: مصیبت برداشت کرنا

پاٹ: چوڑائی

پاجی: گنہگار

پخ: بے کار کی علت

پُرکار: ہوشیار

پراگندہ: پریشان

پرندہ پر نہ مارے گا: کسی کو جانے کی اجازت نہ ہوگی

پروان چڑھنا: بڑا ہونا، مُراد کو پہنچنا

پژمردہ: افسردہ، مرجھایا ہوا

پس دیوار: چھپ کر، خفیہ

پس وپیش: سوچ بچار

پسیج جانا: رحم آنا

پندار: خیال، تصور

پہاڑ ٹوٹنا: رنج وغم کی کثرت ہونا

پیچ: الجھاؤ، چکر

پیرایہ: ڈھنگ

پیادہ: پیدل

پیرو: پیچھے چلنے والا

پیش خیمہ: کسی واقعے کی تمہید

ت

تابع: ماتحت، مطیع، فرماں بردار

تبحر: کسی چیز میں کمال حاصل ہونا

تبختر: ناز، فخر

تحلیل ہوجانا: گھل جانا

تردُّد: فکر، پریشانی

تصوّر: خیال

ترغیب دینا: اکسانا، شوق دلانا

تفاخر: غرور کرنا

تفاوت: فرق

تفویض ہونا: سپرد ہونا

تقطیع: کاغذ کی لمبائی چوڑائی

تقویت: طاقت

تلف: برباد، ضائع

تگ ودو: دوڑ دھوپ، کوشش

تلخ: بدمزہ، ناگوار

تموج: لہریں اٹھنا

تمول: دولت مندی

تمہید: آغاز، ابتدا

تنبیہ: سرزنش، نصیحت

تندی: سختی، غصہ، تیزی

تنعم: ناز و نعمت

تنویر: روشنی

توسل: وسیلہ

توشہ: زادِراہ

تہور: مردانگی، دلیری، شجاعت

تہذیب نوی: نئی تہذیب، مغربی تہذیب

تیر مارنا: کارِ عظیم کرنا

تیرگی: تاریکی، اندھیرا

تھانولا (تھاؤں لا): درخت کا تھالا

ٹ

ٹانٹا: مضبوط، موٹا

ٹھاٹ: شان

ج

جان کے لالے پڑنا: جینے کی امید نہ رہنا

جان چھڑکنا: فریفتہ ہونا، عاشق ہونا

جاڑا: سردی کا موسم

جاہ و حشمت: شان و شوکت

جتن: کوشش

جزا و سزا: انعام اور سزا

جگر پاش: جگر کے ٹکڑے کر دینے والا

جلترنگ: ایک ساز جو چینی کی پیالیوں میں پانی بھر کر تیلیوں سے بجاتے ہیں

جلوت: خلوت کا متضاد، مجمع

جلیل القدر: نہایت معزز

جنوں: دیوانگی، کسی چیز کی دھن

جھاڑ جھنکار: نہایت گھنا اور خاردار پودا

جہانِ آب و گل: پانی اور مٹی کا جہان مراد دنیا

جھڑی: لگاتار بارش

جھینکنا: شکایت کرنا، رونا دھونا، افسوس کرنا

جوتیاں چٹخاتے پھرنا: ادھر ادھر مارے مارے پھرنا

جیّد: زبردست

چ

چنداں: اس قدر، زیادہ، بہت۔

چوبی: لکڑی کا

چھل: دیوار کا حصہ جو گر پڑا ہو

ح

حباب: بُلبلا
حربہ: آلہ جنگ
حرزِ جاں: بہت عزیز
حسرت: آرزو
حق الیقین: پورا یقین
حکمت: دانائی، عقل
حیلہ: بہانہ
حوائج: حاجت کی جمع

خ

خارزار: کانٹوں کا جنگل
خاک میں ملنا: ذلیل ہونا
خانساماں: باورچی
خدائی فوجدار: مفت کا مشیر، خواہ مخواہ صلاح دینے والا
خصلت: عادت، مزاج
خصومت: دشمنی
خضوع وخشوع: عاجزی
خفیف: ہلکا
خنکی: سردی
خلاقی: تخلیق
خلوت: تنہائی
خوابیدہ: سویا ہوا
خوار: ذلیل
خوبو: عادت، طور طریق
خوش آئند: اچھا معلوم ہونے والا
خوش الحان: اچھی آواز والا، سُریلا
خوش نما: خوب صورت

د

داد دینا: کسی کے ہنر، کمال یا خوبی کی تعریف کرنا
داروغہ: محافظ، نگران
دانش: عقل
دفتر: لمبی کہانی
دل زار: پریشان دل
دلاور: بہادُر
دل بھرنا: اکتا جانا
دل گردہ: حوصلہ، جرأت، طاقت، برداشت
درگت: بری حالت
دستار: پگڑی
دم ٹوٹ جانا: سانس اکھڑ جانا
دوبالا: دگنا
دوامی: مستقل، ہمیشہ کے لیے
دُھن: دھیان، شوق، خیال
دھنک: قوسِ قزح

دیار: شہر، علاقہ، مُلک
دیدہ ریزی: باریک کام جس میں آنکھوں پر زور ڈالنا پڑے
دیدہ دانستہ: جان بوجھ کر
دیس نکالا ملنا: جلاوطن کر دینا

ڈ

ڈپٹی کلکٹر: ضلع کا افسرِ اعلیٰ
ڈسٹرب کرنا: تنگ کرنا
ڈل: سری نگر کی جھیل کا نام
ڈیک: جہاز کا عرشہ

ذ

ذوق: شوق

ر

رانی: ملکہ، راجا کی بیوی
ربابِ روح: روح کا ساتھ
رپٹ جانا: پھسل جانا
رختِ سفر: سفر کا سامان
رسوئی کا چوکا: چُولھے اور اس کے گرد کی زمین
رطب اللساں: بہت تعریف کرنے والا، مداح
رضا: خوشنودی، مرضی
رفعت: بلندی
رقابت: دشمنی
رنجیدہ: اداس، افسردہ
روایاتِ کہن: پرانی روایات
روداد: کیفیت، حالت
روش: کیاری
روگ: بیماری
رہن: گروی
ریاضت: محنت، مشقت
ریاکار: منافق، مکار، فریبی

ز

زارنزار: کم زور
زخم پر نمک چھڑکنا: ستائے ہوئے کو ستانا
زعفران زار: وہ جگہ جہاں پہنچ کر انسان کو بہت ہنسی آئے
زیرِ تالیف: جو ابھی ترتیب دی جا رہی ہو
زیست: زندگی

س

زمزمہ پرداز: راگ گانے والا
ساعت: گھڑی

سانحہ: واقعہ، حادثہ
سامعہ نوازی: اچھی آواز سنانا
سبھو: سب لوگ
ستایش: تعریف، حمد وثنا
ستم روزگار: زمانے کے ظلم
سراب: دھوکا ہی دھوکا، زمین کا وہ حصّہ جہاں پانی کا دھوکا ہو
سر پر سوار ہونا: گستاخ ہونا، بہت بے تکلف ہونا
سر کھجانے کی فرصت نہ ملنا: بہت مصروف ہونا
سررشتہ: محکمہ
سرگرم: مستعد، پرجوش
سرگزشت: حال، قصّہ
سرلینا: اپنے ذمّے لینا
سرمغزن: سر کھپانا، مغز مارنا
سُرعت: تیزی
سروکار: واسطہ، تعلق
سعادت آثار: اچھی علامتیں اقبال مندی کے نشانات
سکت: طاقت، قوت
سم قاتل: جلد ہلاک کرنے والا زہر
سنگین: ایک نوک دار ہتھیار جو بندوق پر چڑھایا جاتا ہے
سہارنا: برداشت کرنا
سوختہ خاطر: افسردہ دل
سونے پر سہاگا: خوبی پر خوبی
سوہانِ روح: جان کو چھیلنے والا،
سیال: بہنے والا، مائع
سینچائی: پودوں کو پانی دینا
سیندھی شراب: ایک قسم کی دیسی شراب
سیوا: خدمت

ش

شاذ و نادر: بہت کم، کبھی کبھی
شافی: فیصلہ کُن، قطعی
شاہِ شہاں؛ بادشاہوں کا بادشاہ مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
ششدر: حیران
شعار: چلن، طریقہ
شغل طرب: خوشی کا مشغلہ
شکستہ خاطر: اداس، غمگین، مایوس
شوقِ عمل: کام کا ولولہ
شیر فروش: دودھ بیچنے والا

ص

صعوبت: تکلیف، مصیبت

صلہ: بدلہ

صیاد: شکاری

صیدِ زبوں: بے بس شکار

ض

ضیافت: دعوت

ط

طرح دار: خوب صورت

طرح دینا: ڈھیل دینا

طریق زُہد: پرہیز گاری کی رسمیں، طریقے

طغیانی: سیلاب

طمانیت: اطمینان

ع

عار: برائی

عارضہ: مرض

عالم خواب: نیند کی حالت

عدل ونصفت: انصاف اور برابری

عیار: چالاک، مکار

علیل: بیمار

غ

غایتِ حیات: زندگی کا مقصد

غدر: بغاوت

ف

فاسق وفاجر: گنہگار

فرحت انگیز: خوشی دینے والا

فرسودہ: پرانا، گھِسا ہوا

فصلِ بہار: بہار کا موسم

فضیحت: ذلت، بدنامی، رسوائی

فطرتی: پیدائشی

فکرِ سخن: وہ غور و تامّل جو شعر کہنے کے لیے ہوتا ہے

فکشن (Fiction): افسانہ، من گھڑت قصہ

فیاضی: سخاوت، دریا دلی

فیل: ہاتھی

ق

قابلِ اعتنا: غور کے قابل

قتلہ ہائے ماہی: مچھلی کے ٹکڑے

قدر دان: قدر جاننے والا

قرینہ: ڈھنگ، سلیقہ

قسمت غم: غم کی تقسیم
قصر: محل
قضا: موت
قلزم: گہرا سمندر
قُم: اٹھ کھڑا ہو
قیامت آجانا: مصیبت پڑ جانا

ک

کارِ فضول: فضول کام
کارگزاری: کارکردگی
کاذب: جھوٹا
کامل: تمام، ماہر
کان پر جوں نہ رینگنا: کسی بات کے سننے کا اثر نہ ہونا
کبر: غرور، تکبر
کج: ٹیڑھا
کرچ: ایک قسم کی لمبی تلوار
کسالت: تھکاوٹ
کلا: جبڑا
کم آزار: کم تکلیف دینے والا
کم یاب: کم کم ملنے والا
کُنج: گوشہ، کونا، کنارہ
کنکوا: پتنگ
کوتوال: پولیس کا وہ عہدے دار جس کے ماتحت کئی تھانے ہوں
کوڑھ مغز: بے وقوف، کند ذہن
کوس: تقریباً دو میل
کوفت: صدمہ، دُکھ، تکلیف
کھینا: چپو سے کشتی چلانا
کیف زندگی: زندگی کا نشہ

گ

گاڑھی کمائی، محنت و مشقت سے حاصل کیا گیا مال
گدلا: مَیلا
گراں: مہنگا
گرہ سے باندھنا: یاد رکھنا
گفتار: گفتگو
گھمنڈ: غرور
گل کاریاں: نقاشی، بیل بوٹے
گوش برآواز: کسی کی بات کے سننے کا منتظر
گھمس: حبس، مینہ کے بعد ہوا کا بند ہونا اور سخت گرمی ہونا
گہوارا: پنگوڑا

ل

لاحول ولاقوۃ: اظہارِ نفرت کا کلمہ
لحد: قبر
لطف: مہربانی

لغویات: فضول باتیں
للہ الملک: بادشاہت اللہ کے لیے ہے
لوہے کے چنے: سخت مشکل کام
لیاقت: قابلیت

م

مابعد الطبیعات: فوق الفطرت
ماحصل: نتیجہ، خلاصہ
ماخوذ: لیا گیا
مافیہا: جو کچھ اس میں ہے
مامور: مقرر
مانع: منع کرنے والا، روکنے والا
متشکک: شبہ کرنے والا
متنبہ: تنبیہ کیا گیا، خبردار، آگاہ،
مثمن: آٹھ ضلعوں کی شکل
محوِ بالش: سویا ہوا
مدنی الطبع: فطرتاً اپنے ساتھیوں سے مل جل کر رہنے والا
مردم شناس: وہ شخص جو آدمیوں کی قابلیت کو جانچ لے
مڈبھیڑ: آمنا سامنا
مژدہ: خوش خبری
مست سرود: نغمے میں مست
مستعار: مانگا ہوا

مسحور: جس پر جادو کیا جائے
مشاق: ماہر
مشتبہ: مشکوک
متھ (Myth): فرضی داستان، پریوں اور دیووں کی باتیں
مٹرگشت: سیر
مثل: کہاوت
محاسبہ: بازپرس، حساب
محظوظ ہونا: خوش ہونا
محل سرا: بادشاہوں یا نوابوں کا زنان خانہ
محکم: مضبوط
مروت: لحاظ
مستعد: آمادہ، تیار
مسکن: رہنے کی جگہ
مسمار: منہدم، ڈھایا ہوا
مسودہ: وہ تحریر جو سرسری طور پر لکھی جائے
مصلحت: حکمت
مصنوعی: بناوٹی، نقلی
مضر: نقصان دہ
مضطرب: بے چین
مطلق: بالکل
معاشرت: مل جُل کر زندگی بسر کرنا
معرضِ عتاب میں آنا: کسی کے غصے کا نشانہ بننا

معقول: مناسب، درست
معمور: بھرا ہوا
مقامر: جواری
مقتضا: مطلب، مراد
مقوی: قوت دینے والا
منجدھار: دریا کا وسط
منکسر المزاج: جس کی طبیعت میں عاجزی اور انکساری ہو
مورت: صُورت
موقوف: منحصر
مہا کاج: بڑا کام، سب سے عمدہ کام
مہد: پنگوڑا
میراث: وَرثہ، ترکہ

ن

نابکار: بدکردار، بدذات
ناخدا: ملاح
نادار: غریب
نادر: کم یاب
ناگہانی: اچانک
ناگزیر: ضروری، لازم
نام جو نہیں: بالکل نہیں
نڈر: بے خوف، دلیر، بہادر
نڈھال: کم زور، تھکا ہوا
نخوت: غرور، تکبر
نصیبِ دشمناں: دشمنوں کو نصیب ہو
نغمہ سرائی: گیت گانا
نقارہ: نوبت، طبل
نقدِ عصیاں: گناہوں کی دولت
نگہداشت: حفاظت، دیکھ بھال

و

وقعت: عزت، اعتبار، ساکھ
واسطہ: تعلق
وصل: ملاقات
وحشی: جنگلی

ہ

ہاتھ پاؤں پھول جانا: گھبرا جانا
ہاتھ پاؤں مارنا: کوشش کرنا
ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا: بے کار بیٹھنا
ہاتھ دھو بیٹھنا: مایوس ہو جانا، دست بردار ہونا
ہاتھ مارا: وار کیا
ہادی: ہدایت کرنے والا، رہنما
ہراس: خوف، مایوسی
ہستی: حقیقت، بساط
ہلاکت: تباہی ، موت

ہم خرما و ہم ثواب: ایسا کام جس میں لذت بھی ہو اور ثواب بھی

ہمہ تن: بالکل، سب کا سب

ہیکڑی جتانا: اکڑ دکھانا

ی

یارا: قوت، حوصلہ، طاقت

یاس انگیز: مایوس کن

یک نہ شُد دو شُد: ایک کے بعد دوسری مصیبت

یکسر: سر سے پاؤں تک، تمام، کُل

یلغار حملہ، دھاوا

یورش: حملہ

یوسفِ بے کارواں: اکیلا جس کا کوئی ساتھی نہ ہو

☆O☆
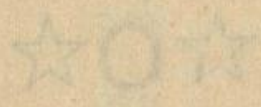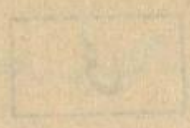
فرمانِ قائدِ اعظمؒ

اسلام ہر مسلمان کے لیے ضابطہ حیات بھی ہے جس کے مطابق وہ اپنی روزمرہ زندگی اپنے اعمال وافعال حتیٰ کہ سیاست، معاشیات اور زندگی کے تمام شعبوں میں بھی عمل پیرا ہوتا ہے۔

(۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب)

اپیل

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ آپ کا اپنا ادارہ ہے جو پنجاب کے طلبہ وطالبات کے لیے معیاری اور سستی کتب مہیا کرتا ہے جن پر بورڈ کا مونوگرام موجود ہوتا ہے۔ ان کی تیاری ماہرین کی زیرِ نگرانی کی جاتی ہے تاکہ بچوں میں تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہوں۔ کچھ ناشرین ایسی کتب شائع کرتے ہیں جن میں سوالاً جواباً مختصر مواد ہوتا ہے۔ ان کتب میں ٹیسٹ پیپرز، گائیڈز، خلاصہ جات وغیرہ شامل ہیں۔ ایسی کتب کو رٹ لینے سے طلبہ وطالبات امتحان تو شاید پاس کرلیں مگر ان کی ذہنی تربیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ ایسے بچے اعلیٰ پیشہ وارانہ اداروں میں ناکام ہوجاتے ہیں۔

محترم والدین، اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ وطالبات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ کسی قسم کی غیر معیاری کتب خریدنے کے پابند نہیں ہیں اور اگر کوئی فرد انھیں اس سلسلے میں مجبور کرے تو چیئرپرسن، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو اطلاع دیں۔

ڈاکٹر فوزیہ سلیمی
پی ایچ ڈی فزکس (گلاسگو)
(ستارۂ امتیاز، اعزاز فضیلت)
چیئر پرسن
پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ
21-E-II، گلبرگ III، لاہور۔

قومی ترانہ

پاک سرزمین شاد باد　　کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان　　ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سرزمین کا نظام　　قوّتِ اُخوّتِ عوام
قوم ، مُلک ، سلطنت　　پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ ستارہ و ہلال　　رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال　　جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

تاریخ اشاعت	تجرباتی ایڈیشن	طباعت	تعداد اشاعت	قیمت
مئی 2003ء	اوّل	سوم	20000	16:00